قال رسول الله صلی اللہ علیہ وسلم بلغوا عنی ولو آیۃ

رواہ البخاری

سلسلہ

التبلیغ

کا

تینتالیسواں وعظ مسمیٰ بہ

الباطن

منجملہ ارشادات حکیم الامت حضرت مرشدی و مولائی مولانا شاہ

محمد اشرف علی صاحب تھانوی دام ظلہم العالی

حسب فرمائش جناب ناظم صاحب امداد المواعظ تھانہ بھون

احقر شبیر علی عفی عنہ

مالک مطبع اشرف المطابع تھانہ بھون کے اہتمام سے چھپا

مطبوعہ جید برقی پریس بلیماران دہلی

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الوعظ مسمّیٰ بہ

الباطن

اشتات	المستمعون	من ضبط	ماذا	کیف	کم	متی	این
[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]	[illegible]
		[illegible] تھانوی	ازالۂ غفلت ضرورت اصلاح باطن	[illegible] بیٹھ کر	۱ گھنٹہ ۵۵ منٹ	۱۳ ربیع الاول ۱۳۳۵ھ [illegible] ۱۹۱۶ء	[illegible] العلوم [illegible]

دعا خطبہ۔ اما بعد فقال النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ۔
یہ جملہ ایک حدیث ہے یعنی ارشاد ہے جناب رسول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا۔ اسمیں حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ایک مضمون کی ضرورت عجیب عنوان سے ارشاد فرمائی ہے۔ جو مجمل طور پر ترجمہ سے اور مفصل طور پر شرح سے ظاہر ہوگی۔ وہ مضمون بظاہر سرسری معلوم ہوتا ہے مگر واقع میں نہایت ضروری ہے اور ہم لوگوں نے اسیطرح اکثر ضروری مضامین کو سرسری سمجھکر چھوڑ دیا ہے۔

اور سرسری ہونا اس مضمون کا عنوان سے مفہوم ہوا کیونکہ حضور نے معمولی الفاظ میں اسکی ضرورت کو ظاہر کیا ہے مقدمات اور شکل کی صورت میں اسکو بیان نہیں فرمایا اور یہ عادت ہے انبیاء علیہم السلام کی کہ تعلیم میں بہت سہولت فرماتے ہیں۔ انکی تعلیم میں کہیں پیچیدگی اور الجھن نہیں ہوتی۔ بخلاف دوسرے اہل فنون کے کہ انکی تعلیم میں پیچیدگی اور الجھن بہت ہوتی ہے بلکہ اسکا اہتمام کیا جاتا ہے۔ کہ پیچیدگی اور الجھن ہو۔ اور یہ کبھی تو اظہار کمال کے لئے ہوتا ہے کہ ہمارے ایسے دقیق علوم ہیں۔ اور کبھی یہ پیچیدگی اور الجھن قلت شفقت کی وجہ سے ہوتی ہے کہ انکو اسکی پروا نہیں ہوتی کہ کسیکو یہ فن آوے یا نہ آوے لہٰذا یہ لوگ ان فنون کے بیان میں سہولت کا اہتمام نہیں کرتے۔ بلکہ پہلی صورت میں تو عدم سہولت کا اہتمام ہوتا ہے کہ فن کو قصداً ایسا مشکل کرکے بیان کیا جائے کہ ہر شخص کی سمجھ میں نہ آسکے جب ہی تو انکا کمال ظاہر ہوگا۔ اور دوسری صورت میں عدم اہتمام ہے سہولت کا کہ بے پرواہی کے ساتھ بیان کرتے ہیں اتفاق سے کبھی سہل بھی ہوجاوے تو ہو جائے۔ لیکن ان کا یہ قصد نہیں ہوتا کہ سہولت ہو۔ ان دونوں صورتوں میں یہی فرق ہے ایک میں قصداً مضمون کو مشکل کیا گیا ہے اور دوسرے میں سہولت کی طرف توجہ نہیں کیگئی۔ پہلی صورت میں مضمون ہمیشہ مشکل ہوگا اور دوسری صورت میں کہیں مشکل ہوگا اور کہیں نہیں ہوگا۔ لیکن اس بات میں دونوں صورتیں شریک ہیں کہ مضمون سہل نہیں کیا گیا اور نیز اتنا عام فہم تو کبھی نہ ہوگا۔ جتنا کہ اس صورت میں ہوتا ہے جبکہ قصداً اہتمام سہولت کا کیا جاوے۔ غرض دیگر علوم و فنون میں ہمیشہ پیچیدہ تقریر اور گنجلک مضامین ہوتے ہیں جیسے بعض شعراء اپنی نظم میں لغت بہت نئے نئے داخل کرتے ہیں تاکہ قادر الکلام اور فاضل سمجھے جاویں یا بعضے نثر میں بھی نئے نئے اور مشکل اور غریب لغت داخل کرتے اور اس میں کسی زبان کی تخصیص نہیں بعضے عربی داں عربی کی عبارت ایسی لکھتے ہیں کہ بغیر قاموس اور صراح کے سامنے رکھے ہوئے وہ سمجھ ہی میں نہیں آسکتی۔ اسیطرح بعض فارسی داں ایسی فارسی لکھتے ہیں کہ اسمیں ضرورت سے زیادہ عربی لفظ مفرد اور مرکب داخل ہوتے ہیں اور آجکل اردو دانوں میں تو یہ مرض بہت ہی ہے۔ کہ کہنے کو تو انکی عبارت اردو ہوتی ہے مگر بعض جگہ تو آدھی انگریزی اسمیں شامل ہوتی ہے اور یہ نہیں کہ وہ اردو لکھ نہیں سکتے کیونکہ اردو تو مادری زبان ہے بلکہ اسکی وجہ صرف یہ ہے کہ

جتلانا چاہتے ہیں کہ ہم انگریزی کے ایسے قابل ہیں کہ انگریزی گویا ہماری مادری زبان ہوگئی ہے یہ خبط اخباروں میں زیادہ ہے حالانکہ اخبار کے موضوع کے یہ بات خلاف ہے کیونکہ اخبار سے تو خبروں کی اشاعت اور عام کرنا مقصود ہے۔ اسی واسطے اخبار اُردو کا نکالا جاتا ہے مگر جب اسمیں آدہی انگریزی شامل ہے تو خبروں کو عموم کہاں ہوا۔ اس صورت میں تو ان مضامین کو انگریزی دان لوگ ہی سمجھیں گے۔ اور ظاہر ہے کہ انگریزی دان ایک خاص جماعت ہے تو اخبار عام کہاں ہوا۔ یہ کیسی کھلی ہوئی بات ہے مگر اہل اخبار کی اسپر نظر نہیں یہ تو اہل دُنیا کا حال ہے بعض اہل علم علوم شرعیہ میں بھی لغات ٹھوستے ہیں جسکا منشاء زیادہ تر تصنع ہے اور یہ تصنع بھی عجیب مرض ہے اسکی جب عادت ہوجاتی ہے تو اسمیں کچھ لطف آنے لگتا ہے۔ ایک رئیس صاحب کو مرض تھا کہ ہر بات میں موٹے موٹے لغت بولتے تاکہ لیاقت اور قابلیت خوب ظاہر ہو مگر ایسے لوگ عوام ہی میں بیٹھکر خوب لیاقت بگھارا کرتے ہیں۔ اہل علم کے سامنے بولیں تو معلوم ہو اول تو اہل علم کے سامنے ایسی ہمت ہی نہیں ہوسکتی اور اگر کوئی ہمت کرے بھی تو راز کھلجاوے اور غلطی پکڑ لیجاوے تو اون رئیس صاحب کو ایک دفعہ کاشتکاروں سے یہ پوچھنا تھا کہ بارش ہوئی ہے یا نہیں تو سیدھی بات تھی یوں پوچھ لیتے کہ بارش ہوئی یا نہیں یا مینہہ برسا یا نہیں مگر اُن صاحب نے کسقدر گت بنائی اس ذراسی بات کی۔ آپ اُن کاشتکاروں سے پوچھتے ہیں کیوں صاحبو؟۔ امسال کشت زار گندم پر تقاطر امطار ہوا یا نہیں۔ وہ کاشتکار اونکے مُنہ کو دیکھنے لگے گنوار ہوتے ہیں بڑے ذہین شہری لوگ تو چکنے چپڑے بہت ہوتے ہیں مگر گانوں کے لوگ بات کے سمجھنے والے بہت ہوتے ہیں بعض موقع پر ایسی بات کہہ اُٹھتے ہیں کہ شہری کو کبھی بھی نہ سوجھے۔ اُن میں سے ایک اپنے ساتھیوں کو مخاطب بناکر بولا اسوقت میاں قرآن پڑھ رہے ہیں چلو جب یہ آدمیوں کی بولی بولیں گے اُسوقت آنا۔ غرض عنوان کو مشکل اسواسطے کیا جاتا ہے تاکہ کوئی سمجھے نہیں کوئی ان سے پوچھے کہ پھر بات ہی کیوں کہی جب اسکا سمجھانا ہی مقصود نہیں۔ ایسی عبارت تو اسکا مصداق ہے

بک رہا ہوں جنون میں کیا کیا ✤ کچھ نہ سمجھے خدا کرے کوئی

بعض شعراء اور اہل زبان کو بھی یہ خبط ہوتا ہے کہ قصداً اپنی عبارت کو مشکل کرتے ہیں۔ باقی عقلاء کے علوم وفنون کچھ تو مشکل ہوتے بھی ہیں۔ لیکن زیادہ پیچیدگی طرز بیان سے بھی ہوجاتی ہے۔

اخباروں میں انگریزی الفاظ کا ہونا بے موقع ہے

امیروں میں بعض کو مشکل الفاظ بولنے کا شوق

دیکھیے فلسفہ و منطق کو بڑا مشکل فن مانا جاتا ہے حالانکہ فن درحقیقت زیادہ مشکل نہیں اسکا بیان البتہ بہت پیچیدہ ہے۔ غرض عقلاء کے فنون کوہ کندن وکاہ برآوردن کا مصداق ہیں کہ بہت سے مبادی اور مقدمات کو پیش نظر کرکے اُنکے مطلب تک پہونچنا ہوتا ہے مگر حاصل کچھ بھی نہیں۔ اُن میں محنت بہت اور حاصل کم ہے۔ بخلاف علوم شرعیہ کے کہ ان میں اسکا عکس ہے۔ کہ محنت کم ہے اور حاصل بہت ہے۔ ایک طالب علم نے علوم محمودہ اور مذمومہ کے متعلق خوب فیصلہ کیا اس سے اور ایک فلسفی سے بحث ہوئی فلسفی نے کہا دیکھو ہمارے علوم کیسے دقیق ہیں کہ تم جیسوں کی سمجھ میں بھی نہ آویں اور تمہارے کیا علم ہیں کہ نماز فرض ہے وضو ایسے ہوتا ہی اس میں کیا باریکی ہے اسنے کہا کہ تمہارے علوم تو ایسے ہیں جیسے سور کا شکار کہ مشکل تو اسقدر کہ گھوڑا بھی چاہیئے اور بہت سے آدمی بھی چاہئیں اور ہتیار بھی چاہئیں اور اسپر جان کا بھی خطرہ اور حاصل کیا ہوا سور جو سُسرا نہ کھانے کا نہ کسی مصرف کا۔ اور ہمارے علوم ایسے ہیں جیسے کبوتر کا شکار جو بے بندوق کے ہی ملجاوے غلہ ہی سے مارلو جال ہی سے پکڑلو اور ہر جگہ کثرت سے ہے کہیں دور جانے اور کسی سامان کی ضرورت نہیں اور ایسا بے خطر کہ حملہ بھی کچھ نہیں کرتا غرض نہایت سہل اور بےخطر اور پھر کام کا کھانے کے کام میں آتا ہے زبان کا بھی مزا اور غذا بھی تو یہ شکار اچھا یا وہ شکار اچھا کہ جان ماری اور محنت کی اور خطرہ میں پڑے اور اخیر نتیجہ نکالا جاوے تو حاصل کچھ بھی نہیں مردار اور نجس العین ہے۔ ایسے ہی تمہارا فلسفہ ہے کہ پڑھتے پڑھتے دماغ خراب کرلیا اور اخیر نتیجہ کیا کچھ بھی نہیں سوا اسکے کہ اشراقیین کی یہ رائے ہے اور مشائین کی یہ رائے ہے معلوم نہیں کونسی غلط ہے اور کونسی صحیح ہے اور ہمارا علم یہ ہے کہ اول ہی دن سے ہم نے پڑھا کہ وضو میں اتنے فرض ہیں اور وضو کرنا شروع کردیا۔ اسیوقت سے حاصل نکلنے لگا اور عمل پر ثواب کی اُمید ہوئی اور تمہیں کیا ملا۔ کونسا ثواب مشائین یا اشراقیین کی رائے پر ملنے کی اُمید ہے۔ بس یہی فرق ہے انبیاء علیہم السلام کی تعلیم میں اور حکماء کی تعلیم میں فلسفہ تو آگے ہے منطق ہی میں دیکھئے کسقدر مباحثات اور مناظرات ہیں ایک ذراسی بات ہے مگر وہ طے ہی نہیں ہوتی خواہ مخواہ فضول جھگڑے بھردئے اور اوسپر نازاں ہیں کہ ہمارے علوم بڑے دقیق ہیں۔ دقیق بیشک ہیں مگر اس دقت کا حاصل کیا ہے اگر کوئی بات مشکل سے حاصل ہو لیکن یہ امید ہو کہ اسکو حاصل

علوم محمودہ و مذمومہ کی مثال

تفاوت تعلیم انبیاء و حکماء یونان

کرکے کوئی نتیجہ معتد بہ حاصل ہوگا تب بھی مضائقہ نہیں۔ لیکن یہاں حاصل کے نام صفر ہے۔ تمام عمر اسی لوٹ پوٹ میں رہو کہ یہ ٹھیک ہے یا وہ ٹھیک ہے اور طے جب بھی نہ ہوا کہ کیا ٹھیک ہے اور اگر طے بھی ہو جائے کہ امر حق یہ ہے تب بھی اسکا کچھ حاصل نہیں صرف ایک بات کا علم ہو گیا۔ اس سے کام کونسا نکلا۔ دیکھئے معقول میں پہلے علم ہی کی بحث ہے اور اسمیں اسقدر مناقشات ہیں کہ انکی وجہ سے اس بحث کو معرکۃ الآرا ٹھہرا لیا ہے اس میں سب سے پہلے اسپر بحث ہے کہ علم کونسے مقولہ سے ہے یہ ذرا سی بات ہے مگر لوگوں نے اسمیں کتابیں کی کتابیں سیاہ کر دی ہیں۔ کوئی کہتا ہے مقولہ انفعال سے ہے اور کوئی کہتا ہے اضافۃ سے ہے کوئی مقولہ کیف سے بتلاتا ہے پھر سب طرف سے وہ حجتیں اور دلیلیں پیش کیگئی ہیں کہ آہی تو یہ دماغ پریشان ہوجاتا ہے اور نتیجہ اس بحث کا کچھ بھی نہیں۔ اگر تحقیق ہو بھی گیا اور امر واقعی معلوم ہو گیا کہ علم فلاں مقولہ سے ہے تو ثمرہ علم کا تو نہ بدلا یعنی جو نتیجہ اس علم سے حاصل ہونے والا ہے وہ تو ہر حال میں ایک ہی ہی چاہے علم کسی مقولہ سے ہو اور اگر تحقیق نہ ہوا اور امر حق معلوم نہ ہوا تب بھی ثمرہ نہ بدلا یعنی جو نتیجہ اس علم سے ہونے والا ہے وہ اب بھی مترتب ہوگا۔ بہت ظاہر بات ہے کہ ہم پلاؤ کھاویں یا کوئی معجون کھاویں تو اسکی لذت یا منفعت علم ترکیب پر موقوف نہیں اسکی ترکیب کا ہم کو علم ہو یا نہو منفعت پھر بھی حاصل ہوگی۔ لوگ ساری ساری عمر پلاؤ کھاتے ہیں باورچی پکاتا ہے۔ اور وہ کھا لیتے ہیں۔ اسکی لذت اور منفعت جو اسپر مترتب ہے برابر حاصل ہوتی ہے۔ حالانکہ ترکیب پکانے کی کسی کو بھی نہیں آتی بلکہ واقعہ تو یہ ہی کہ جسکو ترکیب آتی ہے یعنی باورچی وہ پلاؤ کے نتیجہ سے اکثر محروم ہے کیونکہ اُسے پُلاؤ کھانیکو نہیں ملتا۔ نتیجہ صاحب خانہ کو حاصل ہوتا ہے اور پکاتا وہ ہے جسکو دوسرے لفظ میں یوں کہنا چاہیے کہ علم باورچی کو ہے اور ثمرہ علم کا صاحب خانہ کو حاصل ہے علم صاحب ثمرہ سے محروم ہیں اب فرمائیے کہ علم اچھا یا ثمرہ۔ یہی حال علوم حکماء کا اور علوم شرعی کا ہے کہ انکے پاس صرف علوم ہی ہیں اور انھوں نے انکو منتہاء نظر قرار دے رکھا ہے اور ثمرہ حاصل ہے شرعیات جاننے والوں کو۔ انبیاء علیہم السلام نے تو غذا پکی پکائی دی ہے۔ اور حکماء نے پکانا سکھلایا ہے مگر انھوں نے جس چیز کا پکانا سکھلایا ہے وہ کھانے کی ہے بھی نہیں محض سونگھنے کی ہے دن بھر تو سر مارا جب چیز تیار ہوئی تو معلوم ہوا کہ یہ تو کھانیکی نہیں ہی۔

ع چو دم برداشتم مادہ برآمد ؂ اور یہ میں غلط نہیں کہتا ہوں کہ انکی تبلائی ہوئی چیز کھانے کی نہیں ہے بلکہ یہ بالکل سچ بات ہے جن باتوں کو انھوں نے تمام تمام عمر سر مار کر طے کیا وہ اخیر میں غلط ثابت ہوئیں۔ اب دیکھ لیجئے کہ وہ کار آمد ہیں یا نہیں جب غلط ہیں تو کار آمد کیسی تو یہ بات صحیح ہوئی کہ جو چیز انھوں نے پکائی تھی وہ کھانے کی بھی نہ نکلی خلاصہ یہ کہ تعلیم انبیاء علیہم السلام کی سہل ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ فضول باتوں میں ڈالنا نہیں چاہتے۔ کام میں لگانا چاہتے ہیں۔ انکو خلق خدا پر غایت درجہ کی شفقت ہوتی ہے اور اپنی بڑائی جتانا منظور نہیں ہوتی۔ بنار تو سہولت تعلیم انبیاءؑ کی یہ ہے یعنی شفقت لیکن نتیجہ اس سہولت کا یہ ہوا کہ عام فہم ہونے کی وجہ سے لوگوں نے اس تعلیم ہی کو سرسری سمجھ لیا یہ بڑی نادانی ہے یہ ایسا ہے جیسے بعضے مدرس درس کیوقت گنجلک تقریر کرتے ہیں اور بات خواہ معمولی ہی سی ہو مگر اسکو موٹے موٹے الفاظ میں اور پیچیدہ عنوان سے بیان کرتے ہیں اور طالب علموں کا بھی آجکل یہی مذاق ہو رہا ہے کہ وہ بھی ایسے ہی مدرس کے بڑے معتقد ہوتے ہیں اور کہتے ہیں۔ یہ بڑے قابل شخص ہیں اور کتاب خوب پڑھاتے ہیں اور جو محقق لوگ ہیں وہ مشکل سے مشکل مضمون کو بھی سہل کر کے بیان کر دیتے ہیں مگر بعض طالب علم ایسے شخص کو کہتے ہیں کہ انکی تعلیم سرسری اور عامیانہ ہے اور یہ تو بازاری شخص ہیں خوب یہ قدر ہوئی انکی لیاقت کی۔ اور انکو اس شفقت کے بدلہ میں کہ انھوں نے مضمون کو ایسا سہل کر دیا تھا کہ بات سمجھ میں آگئی یہ خطابات عطا ہوئے اس احسان کا بدلہ یہی ہے کہ عامی اور بازاری بنائے گئے۔ لیکن سب برابر نہیں جو طالب علم سمجھدار ہیں اور جنکو تحقیق مقصود ہے وہ تو جب کتاب کے مضمون کو دیکھتے ہیں اور اسکے بعد استاد کی تقریر کو سنتے ہیں تو پھڑک اٹھتے ہیں اور دل سے تعریف کرتے ہیں کہ کیسے مضمون کو کس خوبی سے مختصر الفاظ میں بیان کر دیا اور انکی تقریر کو ہرگز سرسری نہیں سمجھتے۔ غرض یہ بات سمجھ میں آگئی ہوگی کہ جو علوم و فنون مشکل ہیں ان میں طالب کو نفع پہنچانا مقصود نہیں۔ صرف اپنا نام کرنا مقصود ہے اور انہیں طالبین کے ساتھ انکو شفقت نہیں اور جو علوم سہل ہیں اسکے موجد کو نفع پہنچانا مقصود ہے اسلئے محض شفقت کی بنا پر سہولت کو مد نظر رکھا ہے۔ کیونکہ شفیق کو نام سے بحث نہیں ہوتی دیکھئے باپ اپنے بیٹے کی تربیت کرتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ اسمیں کما حقہ لیاقت

پیدا ہو جائے اسکے اخلاق بھی درست ہو جائیں تہذیب میں بھی کوئی کسر نہ رہے تعلیم میں بھی اعلےٰ درجہ پر پہنچ جائے۔ حتیٰ کہ باپ اسمیں بھی دریغ نہیں کرتا کہ بیٹا ان سب باتوں میں اس سے بھی بڑھ جائے مگر باوجود اسکے نام کرنا اور دکھلانا کبھی نہیں چاہتا حتےٰ کہ اسکو اپنی طرف انتساب بھی مقصود نہیں ہوتا کہ یوں کہا جاوے کہ اسکو اسکے باپ نے اس قابل بنایا ہے بس محض شفقت سے بدوں کسی غرض کے یہ چاہتا ہے کہ میرا بیٹا اعلےٰ درجہ کا انسان ہو جائے۔ پھر دیکھئے کہیں باپ بھی بیٹے کو الجھن میں ڈالتا ہے ہرگز نہیں بلکہ مشکل سے مشکل کام کو آسان ذرائع سے سکھلاتا ہے تو کیا بیٹے کو یہ کہنا چاہئے کہ یہ تو معمولی باتیں ہیں اور میرا باپ کسی قابل نہیں جو مجھے مشکل کاموں میں نہیں ڈالتا۔ انصاف تو یہ ہے اور سب جانتے ہیں کہ یہ محض باپ کی شفقت کا نتیجہ ہے کہ سہولت پسند ہے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی شفقت امت پر نہایت درجہ ہوتی ہے کہ باپ کی شفقت بھی اُسکے سامنے کوئی چیز نہیں اور اس کی تصدیق قرآن شریف سے ہوتی ہے۔ حضورؐ کے بارہ میں فرماتے ہیں لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ اَنْ لَّا یَکُوْنُوْا مُؤْمِنِیْنَ۔ یعنی آپکی حالت یہ ہے کہ شاید آپ اپنی جان کھو دینگے اس رنج میں کہ یہ مومن نہیں ہوتے اس سے صاف ثابت ہوتا ہے کہ حضورؐ نے جان پر کھیل کر امت کیواسطے محنت کی ہے اس عنوان سے بیحد محبت اور شفقت ٹپکتی ہے یہاں کوئی یہ نہ سمجھے کہ حق تعالےٰ نے لَعَلَّکَ بَاخِعٌ نَّفْسَکَ بطور مبالغہ کے فرمادیا ہے کہ آپ اپنی جان کھو دینگے کیونکہ حق تعالےٰ کے کلام میں مبالغہ نہیں ہوتا۔ کلام اللہ شاعرانہ کلام نہیں ہے اور یہی وجہ ہے کہ قرآن شریف نظم میں نہیں اُتارا گیا کیونکہ نظم کے حسن میں یہ بات داخل ہے کہ اسمیں مبالغہ ہو۔ دیکھئے شاعروں کے کلام میں کسقدر مبالغہ ہوتا ہے بلکہ شعر اتنا ہی اعلیٰ درجہ کا سمجھا جاتا ہے جتنا اسمیں مبالغہ زیادہ ہو جتنے بھی زمین آسمان کے قلابے ملائے جاویں۔ اتنی ہی تعریف کیجاتی ہے۔ خط و خال اور کمر کی تعریفیں شعراء کے کلام میں دیکھ لیجئے کہ کیسی ہیں آہی تو بہ مبالغہ سے گذر کر کذب تک نوبت آگئی ہے۔ قرآن شریف تو محض نصیحت ہے۔ اسمیں مبالغہ کی کیا ضرورت اور کیا گنجایش ہے۔ قرآن شریف میں سچی سچی باتیں ہیں اور جو قصے ہیں وہ بھی سچے ہیں اور یہ قاعدہ ہے کہ سچا قصہ ہمیشہ مبالغہ سے خالی ہوتا ہے۔ دیکھ لیجئے جو

انبیاء علیہم السلام کی شفقت امت پر باپ کی شفقت سے زیادہ ہے

قرآن شریف کے نظم میں نہ ہونیکی حکمت

قرآن شریف باوجود سچا ہونے کے دلکش ہے

قصے بالکل سچے ہیں اور جنمیں صرف تاریخی واقعات نقل کئے گئے ہیں اُن میں مبالغہ کہیں نہیں ہوگا بلکہ اُنکی عبارت شاعرانہ بھی نہ ہوگی۔ اسی وجہ سے پڑھنے والونکو ان میں کچھ لطف نہیں آتا۔ مگر کلام الٰہی میں یہ نئی بات ہے کہ باوجود سیدھا سیدھا کلام ہونے کے اور باوجود سچے قصے ہونے کے اسمیں یہ خوبی بھی موجود ہے کہ نہایت دلکش ہے اسکی عبارت بھی ایسی ہے کہ پڑھنے سے لطف آتا ہے سچے کلام کو دلربا کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ مگر قرآن شریف باوجود سچا کلام ہونیکے اعلےٰ درجہ کا دلربا بھی ہے یہ اعجاز ہے قرآن کا۔ قرآن شریف کا حسن بمقابلہ دوسرے کلاموں کے ایسا ہے جیسے ایک شخص تو قدرتی حسین ہے۔ کہ خود ہی دلربا ہے نہ اسکو کسی بناوٹ کی ضرورت ہے نہ اسکا حسن کسی وقت جا سکتا ہے اور ایک وہ حسین ہے جو بنا ٹہنا بیٹھا ہے مانگ پٹی جمی ہوئی ہے زیور سے آراستہ ہے اسکا ساز و سامان بھی اعلیٰ درجہ کا ہے۔ اسکا حسن محض بناوٹ ہی بناوٹ ہے سب جانتے ہیں کہ یہ حسن اوس خداداد حسن کے سامنے کوئی چیز بھی نہیں ہے۔ کتنی ہی بناوٹ کیجاوے مگر وہ دلربائی اسمیں کہاں پیدا ہوسکتی ہے جو خداداد حسن میں ہے آخر قدرتی قدرتی ہے اور مصنوعی مصنوعی۔ یہ حسن نہ اسکے برابر دلکش ہے نہ اسکو قیام ہے۔ ابھی ساز و سامان زیور الگ کردو مانگ پٹی بگاڑ دو تو بس کچھ بھی نہ رہے بخلاف قدرتی حسن کے کہ وہ ہر وقت یکساں ہے۔ یہی حالت کلام الٰہی کی ہے کہ اسمیں مبالغہ نہیں جھوٹ نہیں تصنع اور تکلف نہیں پھر بھی دلکش ایسا ہے کہ دوسرا کوئی کلام ہو ہی نہیں سکتا۔ خلاصہ یہ کہ کلام اللہ میں مبالغہ نہیں ہے پھر جو فرماتے ہیں لَعَلَّكَ بَاخِعٌ نَّفْسَكَ أَلَّا يَكُونُوا مُؤْمِنِينَ۔ تو یہ الفاظ ضرور اپنے حقیقی اور سیدھے سیدھے معنی پر محمول ہیں۔ جن سے ثابت ہوتا ہے کہ حضور نے امت کے واسطے ضرور اتنی کوشش اور مشقت کی ہے جسمیں جان بھی کھوئی جاتی تو تعجب نہ تھا اب دیکھ لیجئے کہ وہ بات سچ ہوگئی یا نہیں کہ انبیاء علیہم السلام کو امت کے ساتھ ماں باپ سے بھی زیادہ شفقت ہوتی ہے وہ تو بے لاگ اور بلا کسی طمع کے جسطرح بھی ان سے بن سکے امت کی خیر خواہی کرتے ہیں۔ اور دل و جان سے یہی چاہتے ہیں کہ کسیطرح انکی اصلاح ہوجاوے اور اللہ اور رسول کی اس شفقت کی کوئی نظیر دنیا میں موجود نہیں ہاں اگر کچھ ناتمام نظیر ہے تو باپ کی شفقت ہے بیٹے کے ساتھ۔ کہ باپ بلا کسی طمع اور بلا کسی غرض اور بلا کسی عوض کے بیٹے کی خیر خواہی کرتا ہے

اور اسی فکر میں رہتا ہے کہ یہ درست کیوں نہیں ہو جاتا اور اسی رنج میں تڑپتا ہے اسکے سوا اور کوئی نظیر اللہ اور رسول کی شفقت کی نہیں ہے۔ باپ کو بیٹے کی تربیت میں کبھی یہ بھی خیال نہیں ہوتا کہ میرا نام ہو اور دس آدمیوں کے منہ سے تعریف سنوں۔ یہی حال انبیاء علیہم السّلام کا ہو کہ ہمہ تن اُمت کی اصلاح میں کھپ جاتے ہیں۔ اور انکو اس سے کسی قسم کا بدلہ مقصود نہیں ہوتا۔ حضور صلے اللہ علیہ وسلم نے اُمت کے واسطے کسقدر مشقتیں اور نا اہلوں سے تکلیفیں اٹھائیں لیکن انکا بُرا نہیں چاہا۔ ایسے شخص سے یہ کب ہو سکتا ہے کہ تعلیم کو مشکل کر دے ہرگز نہیں حضور کو تو منظور یہ تھا کہ ہم راہ پر آویں اور کسی اُلجھن میں نہ پڑیں اسواسطے تعلیم کو نہایت سہل کیا اسیطرح مصنفین میں بھی جو شفیق ہوتے ہیں وہ اپنی کتاب کو مشکل نہیں کرتے کیونکہ انکو غرض یہ ہوتی ہو کہ ہماری کتاب سے فائدہ اُٹھایا جاوے نہ یہ کہ ہمارا کمال اور ہماری لیاقت ظاہر ہو۔ بعض شفیق مصنفین نے تو کتاب میں اپنا نام بھی نہیں لکھا۔ دیکھئے کافیہ اور شافیہ میں مصنف نے اپنا نام تک نہیں لکھا۔ پھر دیکھو دونوں کیسی مقبول کتابیں ہیں۔ مصنف نے تو نام بھی نہیں لکھا تھا لیکن خدا کی قدرت ہے کہ دُنیا بھر میں اس کتاب کی اور صاحب کتاب کی کیسی شہرت ہو گئی۔ خوب کہا ہے ؎

بعض شفیق مصنفین نے اپنا نام بھی کتاب میں نہیں لکھا جیسے کافیہ و شافیہ

اگر شہرت ہوس داری اسیر دام عزلت شو + کہ در پرواز دارد گوشہ گیری نام عنقا را

اسکا راز یہ ہے کہ بنائے مقبولیت خلوص ہے جس کام میں جتنا خلوص ہوتا ہے اتنا ہی مقبول ہوتا ہے۔ اور اسمیں اُتنی ہی برکات ہوتی ہیں۔ اور از خود لوگوں کے دلوں میں اُسکی طرف کشش ہو جاتی ہے مولانا کہتے ہیں ؎

کعبہ را ہر دم تجلی میفزود + این ز اخلاصات ابراہیم بود

کعبہ میں اینٹ اور پتھر ہی تو ہیں مگر رکھے گئے ہیں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں سے جنمیں سراسر اخلاص تھا اسی لئے اسمیں انوار و تجلیات و برکات ہیں اور غایت درجہ وقعت ہے اور اسکے مقابلہ میں ایک دوسرا کعبہ[ع] بھی بنایا گیا تھا جو ظاہری ٹیپ ٹاپ میں اس سے

ع اس سے مراد وہ کعبہ ہے جو ابرہہ بادشاہ نے کعبہ شریف کے مقابل میں بنایا تھا اور اس نے کعبہ شریف کے شہید کرنے کے لئے ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ ارادہ کیا تھا اسکا قصہ سورہ الم تر کیف میں مذکور ہے ۱۲

بڑھا ہوا تھا مگر اس میں یہ باتیں پیدا نہ ہوئیں اور جو حشر اسکا ہوا سب کو معلوم ہے۔ اسکی وجہ یہی ہے کہ بنارِ ابراہیمی میں خلوص تھا اور اس بنار میں خلوص تو کیا ہوتا خلوص کا مقابلہ کیا گیا تھا تو اثر میں بھی مقابلہ ہوا۔ بس یہ راز ہے مقبولیت کا۔ جن تصنیفات میں قابلیت دکھلائی جاتی ہے۔ انہیں مقبولیت نہیں ہوتی کیونکہ خلوص نہیں ہوتا۔ جب نام چاہا تو خلوص کہاں۔ اسلئے مخلص شفیق مربی کو اپنے کمال کا یا اپنی شفقت کا اظہار کبھی مدنظر نہیں ہوتا۔ اسواسطے وہ ہر بات میں سہل عنوان تجویز کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اسکی پرواہ بھی نہیں ہوتی کہ اسکی عبارت کیسی ہے وہ بعض وقت دیہاتی اور گنواری بولی بھی اختیار کر لیتا ہے اور جسطرح بھی طالب کو نفع پہونچے وہی طرز اختیار کرتا ہے نہ اُسے نام سے بحث ہوتی ہے اور نہ اس سے کہ کوئی مجھے گنوار کہیگا۔ وہ تو سراپا طالب کی نفع رسانی میں منہمک ہوتا ہے۔ بعض وقت عبارت اُسکی ظاہراً جامع اور مانع بھی نہیں ہوتی مگر ایسی ہوتی ہے کہ طالب کے ذہن میں مطلب کو اتار دیتی ہے۔ اس سب کی بنار وہی شفقت ہی ہے۔ دیکھئے بچے کے ساتھ بیسا اوقات بات کرنے میں باپ توتلا بنجاتا ہے اور جیسے وہ بولتا ہے۔ باپ بھی اسکے ساتھ ویسے ہی بولنے لگتا ہے اسکو مولنا نے بھی ایک شعر میں لکھا ہے۔ جو اسوقت یاد نہیں آتا اسوقت باپ کو اس سے عار نہیں آتی کہ میں کسطرح بول رہا ہوں اور کوئی مجھے توتلا کہیگا۔ وجہ اسکی کیا ہوتی ہے محض یہی کہ بچے کو حقائق سکھلانا مقصود ہوتا ہے اسلئے باپ اسکا ہمرنگ بنجاتا ہے تاکہ اسکا انس بڑھے اور جو بات اسکے ذہن میں پہونچاتا ہے وہ اچھی طرح پہنچ جائے کیونکہ جب وہ بچہ خود توتلا بولتا ہی تو اسیطرح کی بولی کو سمجھ بھی اچھی طرح سکتا ہے اور ظاہر ہے کہ باپ کے اس توتلا بنجانے کو کوئی بھی بُرا نہیں کہتا۔ کیونکہ سب جانتے ہیں کہ اسکی بنار شفقت پر ہے۔ غرض شفقت کا مقتضا یہ ہے کہ تعلیم سہل ہو اسی واسطے اللہ اور رسول کے کلام کا خاصہ ہے کہ وہ سہل ہوتا ہے تاکہ طالب کو سہولت ہو۔ یہ رحمت تو شکر کے قابل تھی۔ لیکن لوگوں نے اسکو اُلٹا سمجھا اور افسوس ہے کہ آجکل یہی وجہ ہوگئی اس کلام کی بیقدری کی۔ غرض چونکہ اللہ اور رسول کی تعلیمات ہم کو سہولت سے حاصل ہوگئیں اسواسطے انکو نظرانداز کر دینا ہمارے نزدیک کچھ بات نہ ہوئی ؎

ہر کہ او ارزاں خرد ارزاں دہد ٭ گوہرے طفلے بقرص نان دہد

شعر اے گرانجاں خوار دیدستی مرا ✤ زانکہ بس ارزاں خریدستی مرا

درحقیقت دیکھو تو کہ اللہ تعالےٰ ہم کو کتنے ارزاں مل گئے کیونکہ ایک عورت کے حاصل کرنے میں جسقدر کوشش کرنا پڑتی ہے اللہ میاں کے حاصل ہونے میں اتنی بھی تو کوشش کرنا نہ پڑی مگر افسوس اسکا یہ نتیجہ ہوا کہ اسقدر بیقدری ہوئی مگر کیا مقتضائے عقل یہی ہے کہ سہل چیز کی بیقدری کیجائے۔ دیکھئے اگر کسیکو ایک ہزار روپیہ کی تھیلی کہیں اتفاقیہ پڑی ہوئی ملجاوے تو کیا اسوجہ سے کہ وہ بے محنت ملگئی ہے اسکو پھینکدینا چاہیئے کونسا عقلمند یہ کہہ سکتا ہے۔ نہیں بلکہ عقل کی بات تو یہ ہے کہ اس چیز کو دیکھا جاوے کہ وہ چیز کس حیثیت کی ہے اگر وہ چیز عظیم الشان اور قابل قدر ہے تو صرف اسوجہ سے کہ سہولت سے حاصل ہوگئی ہے اسکی بیقدری نہیں چاہیئے۔ بلکہ اپنی خوش قسمتی سمجھنا چاہیئے اور خوش ہونا چاہیئے۔ کہ ایسی گراں بہا چیز بے مشقت ہاتھ آگئی اور سمجھئے حق تعالےٰ کی تعلیم کی جسقدر بیقدری ہوئی اسکا مقتضےٰ تو یہ تہا کہ ہم سے اسکو ہٹا لیا جاتا مگر رحمت پر رحمت دیکھئے کہ باوجود اس ناشکری اور بیقدری کے تعلیم سے بھی ہم کو محروم نہیں فرماتے۔ فرماتے ہیں افنضرب عنکم الذکر صفحا ان کنتم قوما مسرفین۔ یعنی فرماتے ہیں کیا ہم تم سے نصیحت کو روک لیں اسوجہ سے کہ تم لوگ حدود سے نکلجانیوالے ہو کسقدر شفقت اور رحمت ہے کہ کجا شان خداوندی اور کجا بندہ اور اسکی یہ ناشکری اور بیقدری لیکن وہ خیرخواہی نہیں چھوڑتے۔ اللہ کی شان تو بڑی ہے علماء ربانی کی شان بھی یہی ہے کہ لوگ انکو کیسا ہی ستاویں اور کیسی ہی مخالفت کریں اور کیسی ہی انکے ساتھ گستاخی کریں لیکن وہ کبھی کسی کا بُرا نہیں چاہتے نہ نصیحت سے رکتے ہیں وہ جب چاہیں گے بھلا ہی چاہیں گے انکا تو یہ مشرب ہوتا ہے۔ شعر

حافظ وظیفۂ تو دعا گفتن است وبس ✤ دربند آن مباش کہ نشنید یا شنید

اہل اللہ کے بہت سے قصے ایسے سنے ہونگے کہ لوگوں نے انکو مارا پیٹا تکلیفیں دیں لیکن انکے منہ سے سوائے دُعا اور نصیحت کے کچھ نہیں نکلا یہ رحمت الٰہی کا ظہور ہے جب مظہر رحمت کا یہ حال ہے تو خود اصل کی جنکی رحمت کا یہ ظہور ہے کیا شان ہوگی۔ ظاہر ہے کہ وہاں تو رحمت بدرجہا زیادہ ہوگی۔ غرض اسی رحمت اور شفقت کا ظہور ہے کہ حق جلشانہ کی

ارزاں مقصود کی بیقدری نہیں

تعلیم کا یہ طرز ہے کہ اسکو نہایت آسان اور سہل رکھا ہے بندو نکو کسی الجھن میں نہیں ڈالا چنانچہ اس حدیث میں ایک نہایت ہی ضروری اور بہت ہی گہری تعلیم ہے مگر الفاظ نہایت سرسری ہیں اسکے ترجمہ ہی سے معلوم ہو جائیگا کہ کس درجہ معمولی عنوان ہے کوئی سخت لغت انمیں نہیں بلکہ مضمون بھی دیکھنے میں بہت دقیق اور عالی نہیں۔ جب اسکا ترجمہ کیا جاتا ہے تو معلوم ہوتا ہے کہ الفاظ تو سہل ہیں ہی مضمون بھی بہت ہی معمولی ہے۔ کیونکہ حدیث میں تین چار لفظ ہیں۔ جنکے معنے بھی وہ ہیں جو رات دن زبان پر آتے ہیں کوئی نئے معنے نہیں ہیں مگر وہاں تو نظر مفید ہونے پر ہے مضمون کے دقیق و عالی ہونے پر نہیں ہے۔ مضامین کا عالی ہونا مفید ہونے کے سامنے کوئی چیز نہیں۔ دیکھئے محمود خان کے نسخے باعتبار مضمون کے عالی نہیں ہوتے اور ان میں وہ لطف نہیں ہوتا جو کسی شاعر کے کلام نظم یا نثر میں ہوتا ہے لیکن کام کی چیز نسخے ہی ہوتے ہیں نظم و نثر کام کے نہیں ہوتے کیونکہ نسخوں پر صحت متفرع ہوتی ہے اور صحت کے بعد ہی سارے کام ہو سکتے ہیں شاعر شعر بھی جب ہی کہہ سکتا ہے جبکہ دماغ صحیح اور طبیعت حاضر ہو اور یہ نسخہ کے استعمال پر موقوف ہے۔ مصرع ؎ کے شعر تر انگیز و خاطر کہ حزین باشد

تو گو نسخہ میں مضامین عالیہ نہیں ہیں لیکن مضامین عالیہ کی جڑ وہی ہے دیکھئے نسخہ میں کچھ بھی پیچیدگی نہیں ہوتی الفاظ بھی معمولی اور اجزا بھی معمولی یہی بنفشہ کاسنی وغیرہ کہ بہت ہی معمولی دوائیں ہیں مگر محمود خان کا یہی کمال سمجھا جاتا ہے کہ انکا نسخہ کم قیمت اور معمولی اور سہل الحصول ہوتا تھا۔ غرض کار آمد چیز تو نسخہ ہی ہے گو دلچسپ عبارت نہ ہو اور شعر کو دلچسپ ہی جسمیں مضامین عالی ہیں مگر کار آمد مطلق نہیں۔ محمود خان کے نسخوں سے مایوس مریضوں کو فائدہ پہونچتا تھا اور بڑے بڑے کام نکلتے تھے بخلاف ذوق اور مومن کے کلام کے۔ کہ مضامین تو ان میں ایسے عالی کہ زمین آسمان کے قلابے ملا دیتے ہیں اور لوگ ان پر وجد کرتے ہیں مگر غور سے دیکھئے تو معلوم ہو گا کہ کذب محض پر جھومتے ہیں اور نسخہ میں دو ہی تین اجزا ہیں اور وہ بھی بہت ہی مبتذل اور مستعمل لیکن دونوں میں فرق یہ ہے کہ ذوق کی کسی غزل سے خواہ وہ کیسی ہی بڑھیا غزل ہو فائدہ کسیکو نہیں پہونچتا اور نسخہ سے فائدہ پہونچتا ہے بسا اوقات یہ بھی ہوا ہے کہ صرف اس کاغذ ہی کو گھونکر پلا دیا تو بوجہ حسن عقیدت

محمود خان کا نسخہ بہتر ہے ذوق کی غزل سے

کے شفا ہو گئی اور غزل سے کہیں ایسا نہ سنا ہو گا۔ غرض مفید چیز میں رنگینی نہیں ہوا کرتی اللہ اور رسول کی نظر مفید ہونے پر ہے مضمون کے عالی ہونے اور اُلجھن میں ڈالنے کی نہیں ہے اور قرآن میں تو ایک نئی بات یہ بھی ہے کہ باوجود عدم رنگینی کے دلربائی بھی ہے حالانکہ نظم نہیں ہے اگرچہ نظم ہونے میں بھی کوئی ضرر نہ تھا کیونکہ یہ نفع تھا کہ ذرا دلفریبی بھی ہوتی۔ مگر چونکہ اسمیں تکلف تھا اسواسطے پسند نہیں کیا گیا اسمیں تعلیم ہے۔ ترک تصنع کی وہاں دلفریبی اور کسی کا دل کھینچنے کی طرف خیال ہی نہیں وہاں تو دل دیتے ہیں۔ دلربائی ان کا پیشہ نہیں۔ بلکہ انکا شعار دل بخشی ہے اسواسطے دلفریبی کی ترکیب کی کیا ضرورت تھی۔ بس کام میں لگا دیا ہے اور زائد از کار باتوں کو چھوڑ دیا ہے۔ غرض شریعت کی تعلیم کا یہی طرز ہے۔ کہ بناوٹ اور اُلجھن کا وہاں کام ہی نہیں۔ سیدھے سیدھے الفاظ ہیں اور عام فہم بات ہے ہاں تعلیم ایسی ضروری اور گہری ہے کہ دوسرا ایسی تعلیم نہیں کر سکتا۔ چنانچہ یہی تعلیم جو اس حدیث میں ہے دیکھ لیجئے اسمیں کوئی تکلف نہیں کوئی عبارت آرائی نہیں کوئی مشکل لغت نہیں سیدھے سیدھے لفظ ہیں اول عنوانات سے کام لیا ہے جو دن رات ہم بولتے ہیں اور بہت آسانی سے سمجھ سکتے ہیں فرماتے ہیں ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ ان اللہ کو مبتدی طالب علم بھی جانتے ہیں لا یستجیب بھی بہت مستعمل لغت ہے دعاء تو ایسا لفظ ہے کہ اُردو خوان تک بھی جانتے ہیں عن حرف ہے بمعنے از فارسی میں اور سے کے معنے میں اُردو میں۔ یہ بھی بہت ظاہر ہے۔ قلب کا لفظ بھی اُردو تک میں مستعمل ہے۔ لاہ کو بھی اطفال مکتب جانتے ہیں کہ اسم فاعل کا صیغہ ہے۔ اور لہو سے مشتق ہے۔ لہو کے معنے غفلت کے ہیں۔ تو لاہ کے معنے غافل ہوئے۔ پوری حدیث کا ترجمہ یہ ہوا کہ حق تعالےٰ دعاء کو غافل دل سے نہیں قبول کرتے۔ دیکھئے اسمیں کوئی لفظ نیا نہیں۔ کوئی معنے مشکل نہیں۔ ساری حدیث میں کوئی بات بھی نئی اور ناشناسا نہیں۔ وہ الفاظ ہیں۔ جو دن رات بولے جاتے ہیں۔ اور وہ معنے ہیں جنکو کوئی یہ نہیں کہہ سکتا کہ نئی بات ہے شاید اس سے کسی کے دل میں یہ سوال پیدا ہو کہ پھر اس تعلیم کی ضرورت ہی کیا ہوئی جب سب چیزیں وہی ہیں جو بارہا کی دیکھی بھالی اور جانی پہچانی ہیں۔ تو اس تعلیم سے فائدہ

کیا ہوا۔ مثلاً اگر کوئی کہے کہ اسوقت رات ہے تو یہ ایسی بات ہے جو سب کے ذہنوں میں ہے۔ پھر اس جملہ کے کہنے سے کیا حاصل ہو گا۔ خوب سمجھہ لیجئے کہ یہاں ایسا نہیں ہے۔ گو عنوان اس حدیث کا بہت واضح ہے۔ اور ترجمہ بھی سیدھا سادھا ہے۔ اجزاء اس تعلیم کے سب معمولی اور جانے پہچانے اور شناسا ہیں۔ مگر ان شناسا اجزاء سے نتیجہ ایسا عجیب نکالا گیا ہے۔ جو کہ شناسا نہ تھا۔ نتیجہ ایسا گہرا ہے کہ کیا مجال جو کوئی دوسرا وہاں تک پہونچ سکے ان معمولی اجزاء کو جوڑ کر اوس ناشناسا نتیجہ کو شناسا کیا گیا ہے۔ یہ فائدہ ہوا اس کلام سے۔ تو یہ جملہ ایسا نہ ہوا جیسے وہ جملہ تھا کہ اسوقت رات ہے۔ اب اسکی مثال ایسی ہوئی جیسے کیمیا کا نسخہ کہ بہت معمولی ادویات سے مرکب ہوتا ہے اسکے اجزاء کچھ ایسے نہیں ہوتے جو امریکہ اور جرمن سے منگانے پڑیں۔ بلکہ وہ نسخہ ایسا ہوتا ہے کہ اوسکا ایک ایک جزو معلوم ہے۔ مگر کیمیا بنجانا ترکیب کا نتیجہ ہے۔ وہی اجزاء ہم دن رات استعمال کرتے ہیں۔ مگر وہ ذرا سی ترکیب جس سے کیمیا بنجاوے ہم نہیں جانتے اسلئے کیمیا سے محروم ہیں۔ کیمیا میں ترکیب کو بڑا دخل ہے بعض وقت ترکیب سے مرکب میں وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جو اوسکے ہر ہر جزو میں نہیں تھی جیسے عرق کافور کہ خشک اجزاء سے بنتا ہے۔ الگ الگ ایک ایک جزو خشک ہوتا ہے مگر سب کو ایک جا کر دینے سے بدوں پانی کے پانی ہوجاتا ہے۔ یہ صرف ترکیب کا اثر ہے جسکو یہ ترکیب معلوم نہ ہو وہ خشک اجزاء کو دیکھکر کبھی یہ تسلیم نہیں کر سکتا کہ یہ اجزاء بدون پانی کے رقیق ہو جاوینگے۔ اور جس نے عرق کافور بنایا ہے۔ اوس نے کوئی نئی چیز نہیں بنائی صرف چند اجزاء کو ایک تناسب کے ساتھ ملادیا ہے۔ جس سے ایک نئی چیز پیدا ہو گئی۔ جو اس ملانے سے پہلے حاصل نہ تھی۔ اسیطرح انبیاء علیہم السلام اور اہل اللہ کی تعلیمیں ہیں۔ کہ عنوان اُنکے نہایت سہل ہیں جنکو عامی لوگ بھی سمجھتے ہیں۔ الفاظ اونکے کچھ غریب نہیں ہوتے۔ اور قصداً مقفا کیے ہوئے بھی نہیں ہوتے۔

اون کے یہاں شاعری سے کام نہیں لیا جاتا لیکن کمال یہ ہوتا ہے کہ اون الفاظ کو ترکیب اس طرح دیا جاتا ہے کہ اس ترکیب سے وہ بات پیدا ہو جاتی ہے جو کسی دوسرے کے ترکیب دینے سے نہیں پیدا ہو سکتی۔ یہ ہے اُنکی خصوصیت

جنکی بدولت اونکو تمام دُنیا سے امتیاز حاصل ہے۔ اونکے معمولی اور عام فہم الفاظ سے وہ نتیجہ پیدا ہے۔ کہ اوس سے کسی کا کان تو کیا کسی کا دماغ اور عقل بھی آشنا نہیں ہوتی اور وہ مضمون ایسا ہوتا ہے۔ کہ بدون اونکے تبلانے کسی کے ذہن میں آ بھی نہیں سکتا۔ اب میں پوچھتا ہوں کہ ایک ایک جزو کو معمولی دیکھکر مجموعہ کو معمولی اور سرسری کہدینا کیسے صحیح ہے۔ جیسے عرق کافور کہ اجزا فرداً فرداً تو معمولی ہیں کوئی اون میں سے نئی اور عجیب چیز نہیں ہے۔ لیکن ترکیب کا یہ اثر ہے کہ بدون پانی کے پانی بنجاتا ہے۔ یہ ضرور عجیب ہے۔ اسکو اسوجہ سے معمولی کہدینا کہ اسکے اجزا معمولی ہیں صحیح نہیں۔ دیکھئے کیمیاگر کے لوگ کسقدر معتقد ہوتے ہیں اور اسکے پیچھے پیچھے پھرتے ہیں۔ قلوب میں اُسکی بڑی وقعت ہوتی ہے۔ حالانکہ غور سے دیکھئے تو وہ صرف یہی کام کرتا ہے کہ شناسا اجزا سے ناشناسا کی رونمائی کر دیتا ہے کیا مطلب کہ وہ ایسی ہی چند مفرد دوائیں جنکو ہم تم سب جانتے ہیں ملاکر وہ چیز بنا دیتا ہے۔ جو ہم تم نہیں بنا سکتے۔ تو اگر معمولی اجزا سے مرکب شدہ مجموعہ بھی معمولی سمجھا جا سکتا ہے۔ تو کیمیاگر کے نسخہ کو بھی معمولی سمجھنا چاہیئے۔ اور کیمیاگر کی بھی کچھ وقعت نہ ہونا چاہیئے۔ حالانکہ حالت یہ ہے کہ کسی کے ساتھ کیمیاگر کا نام لگجانے سے خلقت اوسکے پیچھے پیچھے ہولیتی ہے۔ خواہ واقع میں وہ جھوٹا اور دھوکہ باز ہی ہو۔ اور اگر کوئی واقعی کیمیاگر ہو اور لوگوں کو اس بات کا اطمینان بھی ہو جائے کہ یہ شخص جھوٹا اور مکار نہیں ہے۔ تو اس صورت میں جو اوسکی وقعت اور قدر ہوگی وہ تو محتاج بیان نہیں۔ حالانکہ کام اوسکا بھی یہی ہے کہ بہت ہی معمولی اور مستعمل اجزا سے سونا اور چاندی بنا لیتا ہے اوسکے نسخہ میں ایسے اجزا نہیں ہوتے۔ جنکے لئے یہ کہنا پڑے کہ فلاں جگہ سے منگاؤ اور فلاں جگہ سے منگاؤ۔ جیسے ایک طبیب کے نسخہ میں ایک دوا تھی۔ جسکا نام بیربوج الصنم ہے۔ نسخہ ایک معمولی مرض کا تھا۔ مگر دوا ایسی لکھدی کہ لوگ پریشان ہو گئے۔ عمل دشوار اور مقصود معمولی۔ یعنی ذرا سا مرض تھا۔ چونکہ مریض کی غرض اٹکی ہوئی تھی جھک مارا اور بیربوج الصنم کو تلاش کرکے منگوایا۔ یہ ترکیبیں تو دق کرنیکی تھیں۔ اور یہ کچھ کمال کی بات نہیں۔ کامل طبیب اور کامل کیمیاگر وہ ہے جو ایسا نسخہ تبلاوے جسکے اجزا گھر ہی میں سے نکل آویں۔ اور نتیجہ حاصل ہونے میں اکسیر ہو

ایسا نسخہ ہونا چاہیئے جسکی نسبت عوام تک میں تعریف کا یہ لفظ مشہور ہے۔ کہ فلانے حکیم ایسے تھے کہ کوڑیوں کا نسخہ لکھتے تھے اور نفع لاکھوں کا تھا۔ اسکا مطلب یہی تو ہے۔ کہ نسخہ قیمت میں تو کچھ کوڑیوں کا ہوتا تھا اور منفعت اور اثر میں ایسا کہ دوسرے طبیب کا روپیوں کا نسخہ بھی ایسا کامل نہ ہو۔ یہ اس طبیب کے کمال کی دلیل ہے۔ کہ سرسری اجزاء سے بڑے بڑے کام نکالتا ہے۔ اور جو فن کو جاننے والا ہے۔ وہ اسکی قدر کرتا ہے اور مریض بھی جب دیکھتا ہے۔ کہ ایسے کم قیمت اجزاء سے ایک بڑے مرض کو فائدہ پہنچا تو حیرت میں رہجاتا ہے۔ اور اوسکے علم وفضل کا مقر ہو جاتا ہے۔ اور تعجب سے کہتا ہے کہ کیسے معمولی اجزا سے اس شخص نے نسخہ مرکب کیا ہے۔ غالباً اب سمجھ میں آگیا ہوگا۔ کہ کمال کی بات یہ نہیں ہے کہ مریض کو دشواری میں ڈالا جائے۔ بلکہ کمال کی بات یہ ہے کہ تدبیر نہایت سہل ہو۔ اور اسپر نفع اعلےٰ درجہ کا مرتب ہو۔ اور نسخہ کا بڑھیا ہونا یہ نہیں ہے کہ زیادہ قیمتی ہو۔ اور دشوار اور نایاب ادویہ سے مرکب ہو۔ بلکہ نسخہ کا بڑھیا ہونا اسی میں ہے کہ کم قیمت اور سہل الحصول ہو اور وہی طبیب تعریف کے قابل ہے جو ایسا حاذق اور شفیق ہو کہ مریض کو دق نہ کرتا ہو۔ ایسے ہی شخص کا نسخہ قدر کے قابل ہوتا ہے تو میں پوچھتا ہوں کہ جب انبیاء علیہم السّلام کی تعلیم ایسی ہی ہے کہ نہایت عام فہم اور سہل الحصول اور نتیجہ نہایت قیمتی۔ تو اونکے نسخہ کی قدر کیوں نہیں ہوتی۔ ضرور ہونا چاہیئے۔ اب سُن لیجئے۔ کہ یہاں اس حدیث میں جسکا بیان میں نے شروع کیا ہے ایسے ہی معمولی اجزاء ہیں۔ کوئی جزو اون میں سے ناآشنا سا نہیں۔ اسی وجہ سے میں نے یہ لفظ کہا تھا کہ عنوان سرسری ہے۔ لیکن اجزاء گو کیسے ہی سرسری ہوں۔ مگر مجموعہ میں جو بات ہے وہ سرسری نہیں ہے۔ اور وہ بالکل ناآشنا سا ہے۔ اسکی طرف ذہن نہیں جاتا۔ تو اس عنوان کے سرسری ہونے اور اجزاء کے معمولی ہونے کا نتیجہ عاقل کے نزدیک یہ نہ ہونا چاہیئے کہ اسکو بے وقعتی کی نظر سے دیکھے بلکہ عاقل کو چاہیئے کہ منفعت پر نظر کرے عنوان کے سہل اور دشوار ہونے کو نہ دیکھے اسکو میں ایک عقلی دلیل سے بھی ثابت کرتا ہوں۔ دیکھئے قدرتی رفتار یہ ہے کہ ضروری اور مفید چیز کی مقدار زیادہ ہوتی ہے اور قیمت میں ارزاں ہوتی ہے۔ مثال اسکی ہوا ہے۔ کہ ہوا ایسی ضروری چیز ہے کہ آدمی ایک منٹ کیلئے بھی اوس سے مستغنی نہیں ہوسکتا۔ پھر دیکھئے کہ

ہوا کی مقدار عالم میں کسقدر ہے۔ کوئی جگہ بھی ہوا سے خالی نہیں پھر اسقدر ارزاں کہ اُسکے کچھ
دام ہی نہیں۔ ہوا چنانچہ کہیں بکتی نہیں۔ حالانکہ سب سے زیادہ ہوا ہی بکری کی چیز ہے۔ غالبًا سننے
والے کے دل میں یہ خیال گذرا ہوگا۔ کہ ہوا بھی کوئی بکری کی چیز ہے۔ صاحبو! آخر ہوا بکری کی
چیز کیسے نہیں ہے۔ اسکا تجربہ یوں ہوسکتا ہے کہ کسی کی ہوا پانچ منٹ کے لئے بند کردیجئے۔
دیکھئے اسکی کیا حالت ہوگی۔ اسوقت اوسکی یہ حالت ہوگی کہ اگر وہ ہفت اقلیم کا بھی مالک ہو اور اُسکے
سامنے یہ بات پیش کیجائے کہ اگر تو ہفت اقلیم ہم کو دیدے تو ہوا تجھکو ملسکتی ہے۔ تو وہ سو خوشامد یں
کریگا اور اسکو منظور کریگا۔ ثابت ہوا کہ ہوا اسقدر قیمتی چیز ہے کہ ہفت اقلیم بھی اوسکے سامنے کوئی چیز
نہیں۔ یہ اور بات ہے کہ حق تعالےٰ کا انعام اور فضل اسقدر بے پایاں ہے کہ ہوا بالکل مفت
ملتی ہے اور اس کثیر مقدار میں موجود ہے کہ لوگ اس سے اُکتاتے اور بھاگتے ہیں۔ اور اس انعام
کو ایسا بہا دیا گیا ہے۔ کہ بکنے کا نام اوسکے ساتھ لگانے سے تعجب ہوتا ہے۔ واقعی اگر ہوا کی
قیمت ہوتی تو بادشاہوں کے سوا اسکو کون خرید سکتا۔ غرض یہ تو حالت اوس چیز کی ہوئی۔ جو
سب سے زیادہ ضروری اور سب سے زیادہ مفید ہے۔ کہ اسکی کچھ بھی قیمت نہیں۔ اب اسکے مقابلہ میں
اوس چیز کو دیکھئے جو سب سے کم ضرورت کی ہے۔ وہ موتی اور جواہرات ہیں کہ کسی کام میں بھی نہیں
آتے۔ بقائے حیات انپر موقوف نہیں۔ کوئی کام دُنیا کا انکے بغیر بند نہیں۔ پھر دیکھئے۔ کہ
کمیاب کسقدر ہیں کہ بہت کم آدمی ایسے ہیں جنکے پاس یہ موجود ہوں بہت سے آدمی ایسے
ہیں جنھوں نے جواہرات کی شکل بھی نہیں دیکھی۔ پھر قیمت اسقدر گراں کہ کسی چیز کی بھی نہیں
سُنا گیا ہے کہ بعض بعض جواہرات ایک ایک اقلیم کا مول رکھتے ہیں۔ غرض دیکھہ لیجئے کہ ہوا
بے قیمت چیز تو کام کی ہے۔ اور موتی اسقدر قیمت کی چیز کام کی نہیں ہے۔ ثابت ہوا کہ زیادہ
گرانی اور کمیابی دلیل ہے بے سود ہونے کی اور ارزانی اور سہل الحصول دلیل ہے مفید ہونیکی
لیجئے دلیل عقلی سے بھی ثابت ہوگیا کہ کسی چیز کا سہل اور معمولی ہونا دلیل اوسکے حقیر ہونے کی
نہیں۔ بلکہ اسکا عکس ہے کہ سہل الحصول وہی چیز ہوتی ہے جو واقع میں زیادہ مفید ہوتی ہے۔
اسی بنا پر حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیم چونکہ سہل ہوتی ہے۔ اسلیئے زیادہ مفید ہوتی
ہے۔ یہ راز ہے شریعت کی تعلیمونکے سہل ہونے کا۔ خوب سمجھہ لو اور کبھی بیقدری نہ کرو۔

جواہرات کی بیش قیمتی ہونیمیں حکمت بیکار اور غیر مفید

یہ تعلیمیں سب سہل ہیں۔ لیکن اسقدر جامع اور پُر منفعت ہیں کہ کوئی دوسرا ایسی تعلیم نہیں کر سکتا۔ یہ بیان ہوا لفظ سرسری کے لفظ کے متعلق۔ اب وہ حدیث مکرر سُن لیجئے فرماتے ہیں ان اللہ لا یستجیب اللہ دعاء عن قلب لاہ۔ اس حدیث میں ایک ایسے مرض کی طرف توجہ دلائی گئی ہے جو نہایت دشوار اور خطرناک مرض ہے اور دشواری اسکی اسوجہ سے اور زیادہ ہوگئی ہے۔ کہ وہ مرض مخفی بہت ہے۔ اوس تک کسی کی نظر ہی نہیں پہونچتی۔ جو لوگ اپنے امراض کا علاج چاہتے ہیں۔ اون کا خیال بھی اسکی طرف نہیں جاتا۔ پھر علاج ہو تو کیسے ہو۔ اول تو اس زمانہ میں دین کیطرف توجہ ہی نہیں لوگونکی یہ حالت ہورہی ہے۔ کہ خود بھی دنیا کے درپے ہیں۔ اور تعلیم بھی دُنیا ہی کی رہگئی ہے۔ اگر ایسا بھی ہوتا کہ دنیا کے کسب میں مبتلا ہوتے مگر تعلیم صرف دُنیا کی نہ ہوتی۔ بلکہ کچھ تعلیم دین کی بھی ہوتی۔ تب بھی شکایت نہ تھی۔ کیونکہ اُسوقت تعلیم دینی سے یہ تو سمجھ میں آجاتا۔ کہ ہم ایک خراب چیز اور بڑی بلا میں پھنسے ہوئے ہیں۔ اس سے یہ امید ہوتی کہ شاید کبھی تنبہ ہوجائے اور ان بلاؤں سے چھوٹ جائیں۔ اور جب ان بلاؤں کے بلا ہونے کا علم ہی نہ رہا تو رہائی کی کیا اُمید ہوسکتی ہے۔ غرض دین کا نام ہی نہ رہا۔ اور صرف یہ شکایت نہیں ہے کہ دین کی طرف توجہ میں کمی ہے۔ بلکہ یوں معلوم ہوتا ہے۔ کہ دین سے قطع تعلق اور مبائنت پیدا ہوگئی ہے۔ جسکو کسی چیز سے تعلق ہوتا ہے۔ وہ چیز گو اسکو حاصل نہ ہو لیکن اوس چیز کی خواہش اور اوسکی طرف کشش اور اوس سے مناسبت اور عدم حصول پر حسرت اور حصول کی تمنا تو دل میں ضرور رہتی ہے۔ مثلاً تمول ایک ایسی چیز ہے کہ ہر شخص کو مرغوب ہے۔ گو حاصل ہر شخص کو نہیں ہوتا۔ لیکن دیکھ لیجئے کہ اس سے طبیعتوں کو مناسبت اور اوسکی طرف کشش اور اوسکی خواہش اور اوسکے حاصل نہ ہونے پر حسرت اور حاصل ہونے کی تمنا کس قدر قلوب کے اندر موجود ہے۔ ہر شخص کی حالت یہ ہے۔ کہ جب کسی صاحب تمول کو دیکھے گا تو کم سے کم نظر اوسکی طرف ضرور اُٹھ جائیگی۔ آپ نے یہ بھی کبھی دیکھا ہے۔ کہ ایسا شخص جس کو تمول حاصل نہ ہو وہ صاحب تمول پر ہنستا ہو۔ اگر بالغرض کوئی ایسا کرتا تب کہا جا سکتا تھا کہ اسکو تمول کی خواہش نہیں۔ بلکہ یہ اسکو بُرا سمجھتا ہے۔ مگر اسکا وجود ہی کہیں نہیں ہے۔ دنیا کے بارہ میں تو کہیں اسکا وجود نہیں۔ مگر دین کے بارہ میں علاوہ بے تعلقی کے اسکا

بھی وجہ ہی کہ لوگ دیندار وں پر ہنستے ہیں۔ پھر آپ ہی فرمایئے کہ اس صورت میں یہ کہنا صحیح ہی کہ انکو دین سے مناسبت ہے یا یہ کہنا صحیح ہے کہ انکو دین سے مباینت ہے۔ اگر طالبان دین پر ہنستے نہیں تب بھی کسی درجہ میں یہ کہا جاتا کہ گو دین انکو حاصل نہیں مگر مناسبت ہے۔ لیکن ہنسنا تو صریح دلیل ہے بجائے مناسبت کے مباینت ہونیکی جو القاب طالبان دین کو دیئے گئے ہیں۔ وہ سب کو معلوم ہیں۔ کہا جاتا ہے یہ احدیوں کی پلٹن ہے۔ کوئی کہتا ہے۔ ملائے ہیں۔ کوئی کہتا ہے بسم اللہ کے گنبد کے رہنے والے ہیں۔ کوئی کہتا ہے یہ دیوانے ہیں۔ خیر ہم تو اس لفظ سے نہیں گھبراتے۔ کیونکہ یہ لقب وہ ہے جو حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا تھا۔ لیکن طالبان دین کو بعض مسلمانوں کا ان الفاظ سے یاد کرنا اس کی شہادت اور اقرار ہے۔ کہ وہ دین سے علیحدہ ہیں۔ اور اُن لوگوں کے متبع ہیں جنھوں نے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کو کہا تھا۔ انک لمجنون ہ معلوم بھی ہے یہ کس نے کہا تھا۔ کفار نے اور اعداء دین نے اور دشمنان خدا نے کہا تھا۔ ہیں تو اسکے جواب کی بھی ضرورت نہیں۔ ہمارے لئے تو یہ خوشی کی بات ہے کہ ہم کو وہ لقب دیئے جاتے ہیں جو حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیئے گئے تھے۔ ہم تو ان القاب سے خوش ہوتے ہیں۔ پھر تو نکر جواب کس بات کا دیں۔ مگر ایک جگہ جواب بھی خوب ملگیا۔ قصبہ کرانہ کا قصہ ہی کہ کسی دُنیا دار نے کسی دینی طالب علم کو مسجد کا مینڈھا کہا تھا۔ اُس نے کہا مسجد کا مینڈھا پھر بھی دُنیا کے کتوں سے اچھا ہی ہے۔ یہ ہے پورا جواب جسمیں ایک عجیب لطف ہے۔ کہ یہ انکا اقراری لقب ہے۔ بعض وقت یہ لوگ خود ہی کہا کرتے ہیں۔ اجی ہم تو دُنیا کے کتے ہیں۔ انھوں نے تو اپنے مُنہ ہی سے یہ خطاب لیا ہے۔ اور اس جماعت کا کوئی آدمی اپنے آپ کو مسجد کا مینڈھا نہیں کہتا۔ تو اگر عدالت خداوندی میں یہ مقدمہ پیش ہوا تو یہ کہا جاسکتا ہے۔ کہ اس نے ہماری تذلیل کی اور ایسا لفظ کہا جو توہین کیلئے استعمال کیا جاتا ہے۔ یعنی مسجد کا مینڈھا۔ کیونکہ جو لوگ ایسا کہتے ہیں۔ توہین ہی کے طریق سے کہتے ہیں۔ لہذا وہ توہین کے مجرم ہیں اور اگر وہ دُنیا دار دعوے کرے کہ طالب علم نے میری توہین کی۔ مجھے دُنیا کا کتا کہا۔ تو یہ مقدمہ نہیں چل سکتا۔ کیونکہ اسکے تو وہ خود اقراری ہیں۔ یہ جواب ترکی بترکی ہوا۔ مگر

ہمیں یہ بھی پسند نہیں۔ بلکہ ہمارا مذاق تو یہ ہے۔ کہ وہ ہزار پھبتیاں کہیں۔ مگر ہم اوسکے جواب میں پھبتیاں نہ کہیں گے۔ کیونکہ انبیاء علیہم السلام کا طریقہ یہ نہیں تھا۔ ان حضرات نے کبھی پھبتی نہیں کہی۔ انکو تو حق تعالیٰ کا حکم یہ تھا فاعرض عنھم۔ یعنی مُنہ پھیر لو ان سے یہ حکم نہیں تھا کہ جیسے وہ کہیں ویسے تم بھی کہو۔ حضرات اہل اللہ میں شائستگی ہوتی ہے۔ وہ بدگوئی کو پسند نہیں کرتے۔ اور چھچھوروں کے ساتھ چھچھوا بننا نہیں چاہتے۔ حضرات انبیاء علیہم السلام کی شان تو بڑی ہوتی ہے۔ ہمارے استاد حضرت مولانا سید احمد صاحب دہلوی رحمتہ اللہ علیہ کی بچپن میں یہ حالت تھی۔ کہ جب کھیل میں لڑکے انکو گالیاں دیتے۔ تو وہ جواب میں اونکو گالیاں نہ دیتے تھے۔ بس بڑا جواب یہ تھا کہ تم ہی ہوگے ایسے۔ کیا مزے کا جواب ہے اور یہ بھی بچپن میں تھا کہ اتنا جواب دیدیتے تھے۔ اور بعد میں تو اتنا بھی نہ تھا۔ یہ طریقہ رہا ہے اہل اللہ کا۔ ایک بزرگ کی حکایت ہے۔ کہ انکو کسی نے بُرا بھلا کہا تو بجائے اسکے کہ وہ مکر اسکو جواب دیتے۔ یا بُرا مانتے۔ یہ کہا کہ خدا کا شکر ہے۔ کہ میرے بہت سے عیب تجھیں معلوم نہیں ہوئے۔ ورنہ اور زیادہ بُرا بھلا کہتے۔ دیکھئے کیا شان ہے بزرگوں کی انکا مذاق تو یہ ہے۔ ؎

تُو بھلا ہے تو بُرا ہو نہیں سکتا اے ذوق ✤ ہے بُرا وہی کہ جو تجھکو بُرا جانتا ہے
اور اگر تو ہی بُرا ہے تو وہ سچ کہتا ہے ✤ پھر بُرا کہنے سے کیوں اُسکے بُرا مانتا ہے

وہ تو پرواہ بھی نہیں کرتے کسی کے بُرا بھلا کہنے کی۔ کیونکہ وہ عاشق ہیں اور عاشق کی شان یہ ہوتی ہے کہ اوسکو تو بُرا بھلا سُننے میں مزا آتا ہے۔ ؎

نہ سازد عشق را کنجِ سلامت ✤ خوشا رسوائی کوئے ملامت

عارف شیرازی کہتے ہیں ؎

من حالِ دل اے زاہد با خلق نخواہم گفت ✤ کاین نغمہ اگر گویم با چنگ و رباب اولی

اسمیں چنگ و رباب سے مراد ملامت ہے نہ کہ ڈھولکی اور ستار کی ٹُن ٹُن۔ پھر وہ ان باتوں کا جواب کیوں دیں۔ اونکو لطف آتا ہے ان باتوں میں۔ غرض ان باتوں کے جواب دینے کی پرواہ نہیں کرنا چاہئے۔ ہم تو طالبعلموں کو یہ فہمائش کرتے ہیں کہ جواب و سوال کے

قصے کو چھوڑو۔ اپنے اللہ کا نام لو۔ جواب سوال میں کیوں وقت ضائع کیا۔ دیکھو تمہیں کیا تعلیم دیگئی ہے فرماتے ہیں حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم ان من حسن اِلسلامِ المرء ترکہ ما لا یعنیہ یعنی اسلام کی خوبی یہ ہے۔ کہ فضول بات میں آدمی نہ پڑے۔ جاہل آدمی کا جواب دینا فضول ہی ہے۔ کیونکہ اسکا حاصل کیا۔ اگر جواب دے ہی دیا اور اسکو ساکت ہی کر دیا۔ تو کتنی رکعت کا ثواب ملا۔ اپنا جو اصلی کام تھا۔ خواہ مخواہ اسکا حرج کیا۔ جاہل کو تو اونکی بات کا جواب بھی نہ دے دیکھو کفار نے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کا نام بجائے محمدؐ کے مذمم رکھا تھا۔ لیکن حضور اسکا جواب تو کیا دیتے۔ اس سے بڑھکر یہ کہ صحابہ سے یہ لفظ سُنا نہ جاتا اور اس گستاخی کے سُننے کی تاب نہ لاتے۔ تو حضور اونکی تسلی کرتے اور فرماتے۔ الم تروا کیف صرف اللہ عنی شتم قریش یشتمون مذمما ویلعنون مذمما وانا محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم یعنی دیکھو حق تعالےٰ نے قریش کے برا بھلا کہنے کو اور سب شتم کو مجھ سے کیسا ہٹایا ہے۔ اور مجھے اس کیسا بچایا ہے۔ وہ مذمم کو گالیاں دیتے ہیں اور میں تو محمدؐ ہوں حضورؐ اس طرح تھامتے تھے صحابہؓ کو۔ اور بعض نے ایسے موقع پر جواب دینا شروع کیا۔ تو یہ آیت اُتری۔ وقل لعبادی یقولوا التی ھی احسن ان الشیطان ینزغ بینھم۔ یعنی کہدیجئے میرے بندوں سے کہ وہ بات کہا کریں جو اچھی ہے۔ مطلب یہ ہے کہ بُری بات کے جواب میں بُری بات نہ کہیں۔ شیطان چاہتا ہے کہ ان میں لڑائی کرا دے۔ سُبحان اللہ کیسی تعلیم ہے۔ اور اس سے بڑھکر لیجئے فرماتے ہیں۔ ولا تسبّوا الذین یدعون من دون اللہ فیسبوا اللہ عدوا بغیر علم۔ یعنی مشرکین کے معبودوں کو برا بھلا مت کہو کہ اسکا نتیجہ یہ ہوگا کہ وہ اسکے جواب میں حق تعالےٰ کی شان میں گستاخی کرینگے۔ اللہ اکبر کِسقدر بچایا ہے بیہودہ مشغلوں سے۔ ان سب تعلیمات کا حاصل یہی ہے۔ کہ اپنے کام میں لگو۔ فضول جھگڑوں میں نہ پڑو۔ بُری بات کے جواب میں بُری بات مت کہو۔ یہ بھی فضول حرکت ہے۔ یہ تعلیم تو اونکے اقوال کے جواب میں تھی۔ اَب اونکے افعال کے مقابلہ میں سلئے۔ کیا جواب دیا جاتا تھا۔ حضورؐ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم طائف دعوت اسلام کے لئے تشریف لیگئے۔ تو اون نامعقولوں نے کیا کیا کہ لڑکوں سے حضور پر پتھر پھنکوائے۔ جسم مبارک زخمی ہوگیا یہ حالت گذری کہ کئی وقت کھانے کو نہیں ملا۔

سوائے اسکے کہ حضرت بلال رض کے پاس کچھ تھوڑی بہت باسی سوکھی روٹی تھی۔ یا کچھ کھجو وغیرہ ہونگی اسکو کھاکر پانی پی لیتے۔ مگر اونکے ان افعال کے جواب میں زبان مبارک سے کچھ نہیں فرمایا۔ بلکہ حدیث میں آیا ہے۔ کہ ملک الجبال۔ یعنی وہ فرشتہ جو پہاڑوں پر موکل ہے۔ آیا اور عرض کیا کہ مجھکو خدا تعالےٰ نے بھیجا ہے اگر آپ حکم دیں تو انکو پہاڑوں کے بیچ میں پیس دوں، جواب دیا کہ مجھے اور میری قوم کو چھوڑ دو یہ لوگ ایمان نہیں لائے تو کیا ہے۔ شائد انکی نسل میں سے کوئی ایمان لے آوے۔ باوجود اسقدر تصرفات اختیار میں ہونیکے کہ ملک الجبال حاضر ہے حکم کا منتظر ہے۔ ذرا اشارہ ہو، تو سب کو خاک میں ملا دے۔ لیکن اونکی تکلیف کو گوارا نہیں کیا۔ یہ اونکے ایسے افعال کا جواب تھا۔ جنکے سننے سے بھی غیظ پیدا ہوتا اور جوش اُٹھتا ہے۔ یہ ہیں اخلاق سُبحان اللہ واقعی انبیاء دشمنوں کے بھی خیر خواہ ہوتے ہیں۔ ملا دوپیازہ نے ایک آل نامہ لکھا ہے اُسمیں ایک جملہ یہ بھی ہے کہ الرسول خیر خواہ دشمنان۔ واقعی گرکی بات کہی ہے۔ حقیقت میں رسول کی شان یہی ہوتی ہے۔ کہ وہ دشمنوں کا بھی بُرا نہیں چاہتے۔ دیکھ لیجئے حضور صلے اللہ علیہ وسلم کسقدر شفیق اور رحیم و کریم ہیں کہ ایسے دشمنوں کو بھی تکلیف پہنچانا گوارا نہ کی۔ بلکہ اونکے ساتھ خیر خواہی کی۔ دُنیا میں بھی اور دین میں بھی۔ دُنیا میں تو یہ کہ ملک الجبال کو اُنکے ہلاک کرنے سے منع کر دیا۔ اور دین کی خیر خواہی دیکھئے کہ اونہیں کے واسطے اون کے افعال کے مقابلہ میں کیا دعا فرماتے ہیں۔ اَللّٰھم اھد قومی فانھم لا یعلمون۔ یعنی اے اللہ میری قوم کو ہدایت کر دیجئے یہ لوگ جانتے نہیں۔ کسقدر ترحم کے کلمات ہیں۔ بس وہ حالت ہے۔ جیسے ایک شفیق باپ اپنے ناسمجھ بچے کی گستاخی پر کہتا ہے کہ یہ نادان ہی بھلے بُرے کو جانتا نہیں۔ ایسے ہی حضور فرماتے ہیں کہ انکو ہلاک کیوں کیا جاوے یہ ناواقف ہیں۔ گویا دوسرے لفظ میں یوں فرماتے ہیں۔ کہ یہ جو کچھ نافرمانی کرتے ہیں جان بوجھ کر نہیں کرتے۔ آپ کو یا مجھکو انھوں نے پہچانا نہیں۔ ورنہ ایسا کیوں کرتے۔ دیکھئے دشمنونکے ساتھ کیا برتاؤ ہے۔ انکی تکلیف تو کیا گوارا فرماتے۔ اونکو یہ دعا دیتے ہیں کہ اے اللہ انکو جنت میں بھیجدیجئے۔ ہدایت کی دعا کرنے کا یہی مطلب ہے کہ یہ دوزخ سے بچ جائیں اور جنت میں پہنچ جائیں۔ اس ترحم کی وجہ یہ ہے کہ وہ لوگ اندھے تھے۔ انکو یہ نہیں

کفار کے ساتھ حضور کی رحمت کی مثال

سوجھتا تھا۔ کہ ایمان نہ لانے کا انجام کیا ہوگا۔ اور حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کے سب انجام پیش نظر تھے۔ حضور کو رحم آتا تھا کہ یہ کیا غلطی کر رہے ہیں کہ انجام کو نہیں سوچتے۔ اور اپنے ہاتھوں دوزخ میں گرتے ہیں۔ اسکی ایسی مثال ہے۔ جیسے ایک بہت چھوٹا بچہ سنکھیا کی ڈلی کو اُٹھا کر منہ میں رکھنا چاہتا ہو۔ اور باپ اُسکے ہاتھ سے اسکو چھینتا ہو۔ تو وہ بچہ مچلتا ہے اور ڈلی ہاتھ سے نہیں دیتا۔ جب باپ زیادہ اصرار کرتا ہے۔ تو وہ باپ کو پٹ جاتا ہے۔ اور مارتا ہے اور کاٹتا ہے۔ اسکا نتیجہ کبھی یہ نہیں ہوگا۔ کہ باپ کو غصہ آجائے اور اوسکے مارنے اور کاٹنے کے جواب میں یہ بھی مارنے اور کاٹنے لگے۔ بلکہ آپ دیکھیں گے۔ کہ وہ ہنستا ہی رہے گا۔ نہ اوسکو مارے پیٹے گا اور نہ اوسکو اوسکے حال پر چھوڑ دیگا۔ کہ وہ سنکھیا کی ڈلی کھا جائے۔ بعینہ یہی حالت ہوئی حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ان دشمنوں کے ساتھ کہ تکلیفیں اٹھائیں۔ بھوکے رہے۔ پائے مبارک زخمی ہوگئے۔ مگر ذرا بھی پیشانی پر بل نہیں پڑا۔ نہ انکا ہلاک ہونا چاہا۔ نہ یہ چاہا کہ وہ اپنے حال پر اس گمراہی میں رہیں بلکہ یہی دُعا فرمائی۔ کہ اے اللہ ان کو ہدایت کر دیجئے۔ یہ لوگ ناواقف ہیں۔ یہ ہے طریقہ انبیاء علیہم السلام کا کہ مخالفین کے ساتھ اونکی بُرائی کا جواب بُرائی کے ساتھ نہیں دیتے۔ اونکے متبعین کو بھی یہی طرز رکھنا چاہیئے۔ اگر کوئی بُرا بھلا کہتا ہے کہے وہ اپنا مُنہ خراب کرتا ہے۔ کوئی احدی کہے یا ملانٹا کہے۔ یا دیوانہ کہے اوس سے کچھ تعرض مت کرو۔ اوس نے تو اپنا وقت خراب کیا تم اپنا وقت کیوں خراب کرتے ہو۔ بعض وقت بعض علماء کو یہ خیال ہوتا ہے کہ انکی بدگوئیوں پر صبر کرنے سے انکی دلیری بڑھتی ہے۔ لہذا کچھ جواب دیا جائے میں کہتا ہوں اِنکو اسکی بھی پرواہ نہیں کرنا چاہیئے۔ انکی دلیری بڑھے گی تو اپنے واسطے بُرائی کو بڑھائینگے۔ انکا کیا لینگے۔ خیر یہ تو اپنی جماعت کو مشورہ تھا۔ اصل گفتگو یہ تھی۔ کہ آجکل دین کی طرف سے ایسی لاپرواہی ہے۔ کہ خود تو دین کیا حاصل کرتے اُلٹا ان لوگوں پر ہنستے ہیں۔ جو دین کا نام لیتے ہیں۔ یہ کسقدر دین سے بعد کی دلیل ہے۔ اور اگر کسی کا خیال دین کی طرف ہے بھی تو صرف ظاہر کی اصلاح کا نام دین رکھ لیا ہے۔ نفلیں ذرا زیادہ پڑھ لیں وضع قطع مُسلمانوں کی سی بنالی۔ بس اسکا نام دین ہے۔ انکی نظر بھی اس سے آگے نہیں بڑھتی

جب اس سے آگے نظر ہی نہیں پہونچتی تو اون امراض کا علاج اور اصلاح کیسے ہو جو ظاہر کے علاوہ ہیں اور خطرناک بھی ہیں۔ تو اس خفا کی وجہ سے انمیں اور دشواری پیدا ہوگئی۔ تو آپ سمجھ لیجئے کہ یہ امراض کسقدر قابل توجہ ہوتے پس اس حدیث میں اونکی طرف توجہ دلائی گئی ہے۔ اور اون تمام امراض کی ایک اصل اور جڑ بیان کی گئی ہے اسکی تفصیل سے معلوم ہو گا کہ کسقدر قیمتی بات بیان فرمائی گئی ہے۔ تفصیل یہ ہے کہ دین کے دو جزو ہیں ظاہری اور باطنی اب تو حالت یہ ہے کہ باطن کے نام سے بھی لوگ آشنا نہیں رہے۔ باطن کی جگہ بطن لے لیا ہے۔ بس پیٹ بھر لیا جائے جسطرح بھی ہو حلال سے ہو یا حرام سے دھوکہ سے ہو یا اشراف نفس کے ساتھ ہو بلا طیب خاطر ہو یا جبر سے ہو۔ جسطرح بھی ملجائے لقمہ حاصل کر لیا جاے۔ ہاں بیشک ظاہر کو بعض نے ذرا درست کر لیا ہے اور بس اور اسمیں بھی دو فریق ہیں ایک تعلیمیافتہ اور ایک عوام۔ عوام تو اس بارہ میں اقراری مجرم ہیں۔ خود اپنے مُنہ سے کہتے ہیں کہ جی ہمارا کیا دین الٹی سیدھی ٹکریں مار لیتے ہیں۔ دل دنیا میں لگا ہوا ہے۔ کسی وقت خدا کی یاد دلمیں آتی ہی نہیں۔ خیر یہ بیچارے اقرار تو کرتے ہیں۔ اپنے قصور کا۔ دوسرا گروہ جو تعلیمیافتہ ہے انپر زیادہ افسوس ہے کہ وہ اپنے قصور کے مقر بھی نہیں۔ انکو یہ خیال بھی نہیں آتا کہ دین کا کوئی باطنی جزو بھی ہے۔ عوام کو اتنا خیال تو ہوتا ہے۔ کہ ہم جو کچھ دین رکھتے ہیں وہ محض ظاہری ہے۔ اور باطنی سے ہم محروم ہیں اور یہ تعلیمیافتہ لوگ محروم ہونیکا نام بھی اپنے اُوپر آنے نہیں دیتے۔ کیونکہ شان میں فرق آجائیگا۔ انھوں نے باطنی جزو کو ذہن سے اڑا ہی دیا۔ بس ظاہر پر کفایت کر لی۔ اور اسپر ناز کر بیٹھے۔ اور سمجھ گئے کہ ہم پورے دیندار ہیں۔ اور پھر ظاہر میں سے بھی چھانٹ لیا ہے بعض اجزا کو گویا دین میں سے انتخاب در انتخاب کیا ہے اور اپنے نزدیک ضروری اجزا نکال لئے ہیں اسکے یہ معنی ہیں کہ گویا دوسرے اجزا نعوذ باللہ فضول اور زائد ہیں۔ اور وہ انتخاب کن اجزا کا کیا ہے۔ جنمیں سہولت ہے یا جنکی عادت ہوگئی ہے۔ جیسے نام مسلمانونکا سا رکھ لینا صورت مسلمانونکی سی بنا لینا۔ بہت کیا تو نماز بھی پڑھ لی۔ بس انھیں اجزا کا نام دین سمجھ لیا ہے۔ صاحبو! دین کے اجزا تو یہ ہیں۔ عقائد۔ اعمال۔ معاشرات۔ معاملات۔ اخلاق۔

ان سب کی تکمیل سے دین کی تکمیل ہوتی ہے۔ اب یہ حالت ہے کہ ان اجزاء میں سے بعضوں کا تو نام سنکر بھی لوگ چونکتے ہیں اور تعجب کرتے ہیں۔ بعض وقت زبان سے بھی کہتے ہیں کہ انکو دین سے کیا تعلق۔ معاشرات بھی کوئی دین کے سکھلانے کی چیزیں ہیں۔ یہ تو آپس کے برتاؤ ہیں جو ملنے جلنے سے خود آدمی سیکھ جاتا ہے۔ اس میں بھی مولویوں نے پابندیاں لگا دی ہیں علےٰ ہٰذا معاملات میں بھی ایسی ہی باتیں کہی جاتی ہیں۔ غرض بعض اجزاء کو دین کا جزو ہی نہیں سمجھا جاتا۔ بڑی دوڑ اعمال دیانات تک رہگئی ہے۔ اور وہ اعمال بھی سب نہیں۔ ان میں سے بھی وہی لے لئے ہیں۔ جن کی ایک رسم چلی آتی ہے۔ اور جنکی بچپن سے عادت پڑگئی ہے۔ چنانچہ بڑی دینداری یہ ہے۔ کہ نماز پڑھ لی۔ ڈاڑھی رکھ لی شرعی پائجامہ پہن لیا۔ گوشت کھالیا۔ صورت شکل وضع قطع مسلمانوں کی سی بنالی۔ یہ ان لوگوں کا انتہائی کمال ہے جو اپنے آپ کو دیندار کہتے ہیں۔ اور جو اپنے آپکو دیندار بھی نہیں کہتے اونکا تو یہاں ذکر ہی نہیں۔ غرض دین کے اجزا میں ایسا انتخاب کیا ہے کہ اب خلاصہ کا بھی خلاصہ یعنی گویا جوہر نکل آیا اور دین نام رہ گیا صرف گنتی کے چند اعمال کا اور وہ بھی اس سے زیادہ نہیں کہ ظاہر کے چند شعبوں کو درست کرلیا۔ غرض اوس انتخاب میں بھی جو رہا وہ ظاہر ہی ظاہر رہ گیا۔ اسکے سوا دوسری چیز یعنی باطن کا نام بھی نہیں آتا۔ بس اس ناتمام ظاہر کو بناکر خوش ہیں کہ ہم دیندار ہیں۔ اس بیان سے ظاہر کو بگاڑنے والے خوش نہ ہوں۔ کہ ہم تو دیکھیے ظاہر پرست ہیں مسلمانوں میں اس خیال کے لوگ بھی بہت ہیں جو سمجھتے ہیں کہ باطن کا درست ہونا کافی ہے۔ ظاہر کے درست کرنے کی ضرورت نہیں بلکہ اُنکے نزدیک ظاہر کا درست کرنا باطن کے درست کرنے میں مخل ہے۔ لہٰذا ظاہر کو ایسا بگاڑتے ہیں۔ کہ یہ بھی نہیں پہچانا جاسکتا کہ یہ مسلمان ہیں وضع قطع بھی مسلمانوں کی سی نہیں رکھتے۔ بلکہ نماز بھی نہیں پڑھتے۔ یوں کہتے ہیں کہ کسی کے سامنے نماز پڑھیں گے تو وہ ہمارا معتقد ہو جائیگا۔ اس سے ہمارے نفس کو خوشی ہوگی۔ تو یہ نفس پروری ہوئی۔ اسی قسم کی بہت سی خرافات من سمجھوتا کرنیکے لیے گڑھ لی ہیں۔ اور یوں سمجھتے ہیں کہ ہمارا باطن درست ہے۔ پھر ظاہر کی کیا ضرورت ہے۔ میرے ظاہر آرائی کی مذمت سے احتمال تھا کہ یہ لوگ

خوش ہوتے۔ اسلئے کہتا ہوں کہ ان کو خوش نہیں ہونا چاہیئے۔ کیونکہ میں ظاہر کی درستی کی مذمت نہیں کرتا۔ بلکہ اسپر اکتفا کرنے کی مذمت کرتا ہوں۔ تاکہ اصلاح باطن کی فکر کریں۔ محض اصلاح ظاہر پر قناعت نہ کریں۔ باقی ظاہر کی درستی بھی فرض ہے اسلئے کسیکو یہ گنجائش نہیں کہ اصلاح ظاہر کو ترک کر دے گو بالفرض باطن بھی درست ہو۔ اور ان بددینوں کا تو باطن بھی درست نہیں۔ بلکہ انھوں نے ظاہر اور باطن دونوں کو بگاڑ رکھا ہے۔ ظاہر کو تو بگاڑا ہی ہے باطن بھی بگڑا ہوا ہے۔ اور یہ اس دھوکے میں پڑے ہوئے ہیں۔ کہ ہمارا باطن درست ہے۔ اس سے تو یہی بہتر تھا کہ ظاہر تو درست ہوتا۔ ایک ہی فرض ادا ہوتا۔ اگر ان لوگوں کی طرف سے کہا جائے کہ ہم اسکو نہیں مانتے۔ کہ ہمارا باطن بگڑا ہوا ہے۔ باطن ہمارا بالکل اچھا ہے۔ ہم نے ظاہر کو باطن ہی کے درست کرنے کے لئے بگاڑا ہے۔ کیونکہ باطن کے بگاڑنے والی ایک چیز عجب بھی ہے۔ اس سے بچنے کے لئے ہم نے ظاہر کو بگاڑا ہے۔ اس سے باطن ہمارا بالکل اچھا ہوگیا۔ پھر یہ کہنا کہاں صحیح ہوا۔ کہ انھوں نے ظاہر اور باطن دونوں کو بگاڑ رکھا ہے۔ میں بطور جواب الزامی کے کہتا ہوں کہ ایک شخص بادشاہ سے باغی ہے اور ہر ہر حکم کی مخالفت کرتا ہے۔ اور کسی بات میں اطاعت نہیں کرتا۔ لیکن جب اوس سے پوچھا جاتا ہے کہ تو ایسا کیوں کرتا ہے۔ تو کہتا ہے واللہ میں دل سے بادشاہ کا بڑا خیر خواہ ہوں جو کچھ مخالفت میں نے کر رکھی ہے صرف عجب سے بچنے کیلئے کر رکھی ہے۔ تاکہ میرے خلوص میں فرق نہ آوے۔ بتایئے آپ اوسکو کیا کہیں گے یہی کہینگے کہ جھوٹا بدمعاش غلط کہتا ہے فرمایئے اسکی وجہ کیا ہے۔ جب ایک شخص اپنے منہ سے کہہ رہا ہے۔ کہ میں دل سے مطیع ہوں اور خیر خواہ ہوں۔ تو آپ اوسکو جھوٹا کیوں کہتے ہیں۔ اور اوسکو باغی کیوں سمجھتے ہیں۔ اب میں تحقیقی جواب کے طور پر کہتا ہوں کہ اسکی وجہ سوائے اسکے کیا ہے کہ ظاہر عنوان ہوتا ہے باطن کا۔ جب ظاہر افعال اُسکے مخالفانہ ہیں تو اوسکو کوئی تسلیم نہیں کر سکتا۔ کہ باطن اوسکا موافق اور مطیع ہے۔ اور یہی کہا جاویگا۔ کہ وہ واقع میں بھی مخالف اور باغی ہی اسیطرح سمجھہ لیجئے کہ جب ایک شخص کا ظاہر خراب ہے۔ تو یہ کیسے مانا جا سکتا ہے۔ کہ اسکا باطن درست ہے۔ ظاہر تو تابع ہوتا ہے باطن کے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے

کہ باطن درست ہو۔ اور ظاہر میں اسکا اثر نہ پیدا ہو خوب سمجھ لیجئے کہ یہ ناممکن ہے۔ کہ قلب میں کسی کی اطاعت ہو۔ اور بدون اضطرار کے ظاہر اوسکا مخالف ہو۔ یہ تقریر تو بطور جملہ معترضہ کے درمیان میں آگئی۔ اصل بیان یہ تھا کہ آجکل بہت سے دیندار ایسے ہیں جنھوں نے صرف چند اعمال کی درستی کو دین سمجھ لیا ہے۔ پھر اعمال سے مراد صرف اعمال ظاہری لے لئے ہیں۔ وہ بھی سب نہیں بلکہ معدودے چند۔ جیسے ڈاڑھی بڑھا لی نماز پڑھ لی۔ وضع قطع درست کرلی۔ اور سمجھ لیا کہ ہم پورے دیندار ہو گئے۔ اس تقریر سے چونکہ یہ شبہ ہو سکتا تھا۔ کہ ظاہر کا بنانا کچھ اچھی چیز نہیں۔ اور اس سے وہ لوگ خوش ہوتے۔ جو ظاہر کو بگاڑتے ہیں۔ اسواسطے انکی غلطی کو بیچ میں دفع کر دیا گیا۔ باقی اصل خطاب انہیں لوگوں کو ہے۔ جو صرف ظاہر کے بنانے کو دین سمجھے ہوتے ہیں۔ اور جنکو اپنے مرض کی خبر نہیں۔ اور وہ مرض ہے بھی ایسا جسکی خبر ہونا دشوار بھی ہے۔ اور جب خبر ہونا دشوار ہے۔ تو اسکی اصلاح بھی دشوار ہے۔ خبر کے دشوار ہونیکی وجہ یہ ہے۔ کہ ظاہر کا بگاڑ تو محسوس ہوتا ہے۔ لہذا خبر بھی آسانی سے ہوگی اور اصلاح بھی اسکی آسان ذرا توجہ اور ارادہ کی ضرورت ہے۔ بخلاف مرض باطن کے کہ اوسکے مریض کو اوسکی اطلاع تک بھی نہیں پہنچتی پھر اصلاح کیسے ہو۔ اور جب اس مرض کی خود مریض ہی کو خبر نہیں ہوتی تو دوسرونکو تو کیسے خبر ہوگی۔ کیونکہ وہ دوسروں کو نظر تو آتا نہیں اور بدگمانی کی کسیکو اجازت نہیں تو اس حالت میں دوسرا اس مرض کو سمجھے تو کیسے سمجھے لہذا یہ مرض نہایت دشوار ہوا پس مریض خود علاج کرے تو کیسے کرے۔ اور دوسرا آدمی علاج کرے تو کیسے کرے۔ کیونکہ اطلاع مفقود اور وہی شرط علاج۔ اور اگر کسی مریض کو اپنے اس مرض کی اطلاع ہوتی بھی ہے تو اسکے ساتھ ایک مرض اور بھی لگا ہوا ہے۔ توجیہ اور تاویل کا۔ کہ اسکو کھینچ کھانچ کر مرض کی حد سے نکال لینگے اور ناجائز کو جائز بنا لینگے حالانکہ اگر ذرا بھی دین کا احساس قلب میں ہو تو قلب میں اس تاویل سے ہرگز بشاشت نہیں ہوتی۔ بلکہ قلب میں اسکا اقرار رہیگا۔ کہ یہ گناہ ہے۔ پھر جب خود ہی کو گناہ ہونے کا علم ہے۔ تو اللہ تعالےٰ کو تو کیسے علم نہ ہوگا۔ تو پھر اس توجیہ و تاویل سے کیا کام چلا۔ خدا کے سامنے تو گنہگار ہی رہے ظاہر بینوں کی

نظر میں سرخرو ہوگئے تو کیا؎

کہ ہے اللہ دروغ میزنی ✤ از برائے سکہ دوغے میزنی
خلق را گیرم کہ بفریبی تمام ✤ در غلط اندازی تا ہر خاص و عام
کارہا با خلق آری جملہ راست ✤ با خدا تزویر و حیلہ کے رواست
کار با او راست باید داشتن ✤ رایت اخلاص و صدق افراشتن

ظاہر کے بنانے سے دُنیا تو دہوکہ میں اسواسطے آگئی۔ کہ انکی نظر صرف ظاہر تک ہی۔ مگر باطن کو بگاڑ کر خدا کو دہوکہ کیسے دوگے۔ جبکہ انکی نظر باطن تک بھی پہونچتی ہے۔ دنیا کی نظروں کے سامنے تاویلیں کرکے سرخرو ہوگئے۔ تو کیا ہوا۔ تاویل سے اصل واقعہ تھوڑا ہی بدل جاتا ہے۔ حق تعالے کو تو اصل واقعہ کا علم ہے۔ اور تاویل میں ایک بڑی خرابی یہ ہوتی ہے۔ کہ اوس چیز کی بُرائی پر پردہ پڑ جاتا ہے۔ اصل گناہ تو مرض تہا ہی یہ تاویل کا مرض اس سے بھی زیادہ سخت ہے۔ کیونکہ یہ نہ ہو تو گناہ ایسی چیز ہے۔ کہ اس سے طبائع سلیمہ نفرت ہی کرتی ہیں تو امید ہوسکتی ہے کہ کبھی اس سے تنبہ ضرور ہو جائیگا۔ اور جب تاویل درمیان میں آگئی تو گناہ کی بُرائی پر پردہ پڑ گیا۔ اب تنبہ ہو تو کیونکر ہو۔ اس حالت میں دوسرا آدمی تو اس وجہ سے تنبیہ نہیں کرسکتا کہ وہ ظاہر کو درست پاتا ہے۔ کوئی بُرائی اسکی نظر میں نہیں آتی۔ اور خود تنبہ اسواسطے نہیں رہا۔ کہ مرض پر تاویل کا پردہ پڑ گیا تنبیہ اور تنبہ سب اڑ گئے۔ اب اصلاح کی کیا اُمید ہو۔ دیکھیے کسقدر دشواری ہے۔ باطن کی اصلاح میں بعض وقت یہ ظاہر کو بنانے والے ایک اور طرح فیصلہ کرتے ہیں کہ انہیں تاویل کی بھی ضرورت نہیں ہوتی۔ اور نفس کا مطلب حاصل رہتا ہے۔ وہ یہ ہے کہ اپنے عیوب کو بھی جانتے ہیں۔ اور ان میں کچھ تاویل بھی نہیں کرتے۔ اسلئے اس بات کو مانتے ہیں کہ ہمارے اندر یہ عیب ہیں۔ لیکن ساتھ ساتھ اپنے کمالات کو بھی یاد کرتے ہیں کہ فلاں فلاں کمال بھی تو ہم میں موجود ہیں۔ علم ہے۔ عمل ہے نماز ہے۔ روزہ ہے۔ جب اتنے کمال موجود ہیں۔ تو دو عیوب یہی سہی۔ فیصلہ غلبہ کو ہوتا ہے اور بھلائی زیادہ ہے بُرائی کم تو بھلائی ہی کا حکم ہوگا۔ اس صورت میں کسی

تاویل کی ضرورت بھی نہیں رہی اور اچھے بن گئے۔ اور سب بات قاعدہ کے اندر رہی۔ یہ فیصلہ ذہن کا سب سے بڑا کمال رہا۔ اس سے بات بھی وہی کی وہی رہی۔ اور دل کو اچھی طرح سمجھا لیا کہ ہم اچھے ہیں۔ یہ ایسی مدلل تقریر ہے کہ اسکا جواب دینا بھی مشکل ہے اے صاحبو! دل کو سمجھانا جب کافی ہے۔ کہ ہمارا دل قیامت کے روز فیصلہ کنندہ قرار پاوے۔ مگر قیامت میں تو فیصلہ دوسرے کے ہاتھ میں ہوگا۔ اور وہ حقائق کے موافق فیصلہ کریگا۔ اور اوس روز دل کے سمجھا لینے سے کچھ کام نہ چلے گا۔ اور حقائق کے ظہور کے وقت ممکن ہے کہ آپکا غالب تو مغلوب ہو۔ اور مغلوب غالب ہو۔ دوسرے میں کہتا ہوں کہ آدمی کو ضرورت تو اصلاح کی ہے۔ اور ان عیبوں کے دور کرنے کی جو اوسکے اندر ہیں۔ تو کیا اس دل کے سمجھا لینے سے ان عیبوں کی اصلاح ہوگئی۔ ہرگز نہیں۔ بلکہ جیسے تاویل سے اون عیبوں پر پردہ پڑ گیا تھا۔ اسیطرح اوس فیصلہ سے بھی پردہ پڑ گیا تاویل بھی ایک مرض تھا یہ بھی ایک مرض ہے۔ وہ ایک قسم کا پردہ تھا یہ دوسری قسم کا پردہ ہے۔ بلکہ یوں کہنا چاہیئے۔ کہ یہ بھی ایک قسم کی تاویل ہی ہے۔ اسمیں اور اوسمیں اتنا فرق ہے۔ کہ اس تاویل کا حاصل یہ تھا کہ گناہ کو گناہ نہ تسلیم کیا تھا۔ اس وجہ سے نفس پر دھبہ نہ آیا۔ اس تاویل میں اس سے بھی بڑھکر کمال ہے کہ گناہ کو گناہ رکھا اور نفس پر دھبہ اب بھی نہ آیا۔ خیال کریئے کہ یہ کسقدر گہری تاویل ہے۔ بہرحال اتنی لمبی تقریر سے یہ بات ذہن میں آگئی ہوگی کہ امراض باطن کا ادراک نہایت دشوار ہے کیونکہ اتنے موانع موجود ہیں اور پردوں پر پردے پڑے ہوئے ہیں جب اسکی اطلاع دشوار ہے تو ظاہر ہے کہ علاج بھی دشوار ہے کیونکہ مرض کا علاج تو جب ہی ہو سکتا ہے جب مرض کی خبر ہو۔ اور جب خبر ہی نہیں تو علاج کیسا۔ اسی دشواری کو دیکھکر بعض لوگوں نے تو ہمت ہار دی ہے۔ کہ کون علاج کرے۔ اگر ہمارے اندر امراض ہیں تو بلا سے۔ اللہ میاں بڑے کریم ہیں۔ ہم گنہگار رہیں اللہ میاں معاف کرنے والے ہیں۔ پھر کیوں مصیبت میں پڑے۔ کہ اصلاح کرنے والے کو تلاش کرو اسکے نخرے اٹھاؤ۔ ہر وقت اسی ادھیڑ بن میں رہو۔ اچھی خاصی مصیبت ہے۔ جب اللہ میاں رحیم کریم ہیں تو کیا ضرورت ہے اس مصیبت اٹھانے کی۔ وہ اپنی رحمت سے خود ہی سب کام بنا دینگے۔ یہ ان لوگوں کے

خیالات ہیں جو دیندار بننا چاہتے ہیں۔ اور کوئی کام خلاف شریعت کرنا نہیں چاہتے ۔ انکے ذہن میں نماز کی بھی ضرورت ہے۔ حج کی بھی ضرورت ہے۔ روزے کی بھی ضرورت ہے۔ ڈاڑھی کی بھی ضرورت ہے مگر قلب کیطرف کبھی انکو توجہ نہیں ہوتی کہ اسکے بھی کسی مرض کے اصلاح کیضرورت ہے یا نہیں پس سُن لیجئے کہ قلب میں بھی کچھ امراض ہیں۔ اور اونکے دُور کرنیکی بھی ویسی ہی ضرورت ہے جیسے کہ ظاہر کے سنوارنے کی ضرورت ہے۔ جیساکہ میں نے طویل تقریر سے ثابت کر دیا۔ اب یہاں دو چیزیں قابل غور ہیں۔ ایک یہ کہ وہ باطنی امراض کیا کیا ہیں۔ دوسرے یہ کہ خدا کے ساتھ ہم کو کیا تعلق ہونا چاہیئے۔ یہی دو امر خلاصہ ہیں۔ آج کے بیان کے۔ ان دونوں کا جوڑ ابھی سمجھہ میں نہ آیا ہوگا۔ لیکن آگے چلکر معلوم ہو جاویگا۔ یہاں اجمالاً اتنا سمجھہ لیجئے۔ کہ ان دونوں میں سے ایک اصل ہے اور دوسرا اوسکی فرع یعنی نتیجہ اور اثر ہے۔ وہ اصل امر ثانی ہے۔ یعنی یہ کہ ہم کو خدائے تعالے کے ساتھ کیا تعلق ہونا چاہیئے اور امر اوّل یعنی تحقیق امراض اسکی فرع ہے۔ اگر یہ اصل سمجھہ میں آگئی۔ تو سب امراض کی حقیقت اور اونکا علاج معلوم ہو جاویگا۔ اوس اصل کا بیان سنئے۔ یعنی یہ بات کہ خدائے تعالے کے ساتھ ہم کو کیا تعلق ہونا چاہیئے ایسی کھلی ہوئی بات ہے۔ جسکی زیادہ شرح کی ضرورت نہیں۔ ایک مختصر سی بات یہ ہے کہ تمام تعلقات کی بنا ر ہوتی ہے ۔ احسان پر جتنا کسی کی طرف سے کسی پر احسان زیادہ ہوتا ہے اتنا ہی اسکو تعلق زیادہ ہوتا ہے۔ خدا تعالے کے احسانات ہم پر جسقدر ہیں۔ محتاج بیان نہیں۔ ہم کو جو کچھ حاصل ہے وہ سب خدا ہی کے دینے سے ہے۔ کوئی وقت بھی ایسا نہیں جو خدا تعالے کے احسان سے خالی ہو۔ اتنے احسانات ہمارے اوپر کسی کے بھی نہیں ہیں اور نہ ہو سکتے ہیں جتنے خدا تعالے کے احسانات ہیں تو بنا بر قاعدہ مذکورہ ہم کو کسی سے بھی اتنا تعلق نہ ہونا چاہیئے۔ جتنا خدا تعالے سے ہونا چاہیئے۔ اور اسکی بھی شرح ہو جانی چاہیئے کہ تعلق کس چیز کا نام ہے۔ تعلق کے معنی ہیں لگاؤ اور لگاؤ سے مراد ہے دل کا لگاؤ مگر دل کا لگاؤ یہ نہیں ہو کہ دل کسی کے ساتھ بندھنے میں چپک جائے بلکہ دل کے لگاؤ کے صرف یہی معنی ہیں کہ دل اسکی طرف متوجہ رہے اور دل میں اس درجہ اوسکی یاد رہے۔

جسکو عرف میں دل میں بس جانا کہتے ہیں۔ اب آپ غور کر لیجئے کہ ہم کو خدائے تعالےٰ کے ساتھ یہ تعلق حاصل ہے یا نہیں۔ ہر شخص غور کرے کہ رات دن میں کتنا وقت اسکے لئے ملتا ہے اگر کوئی خیال کر کے دیکھے گا۔ تو یہ بات صحیح پائے گا کہ سب چیزونکی یاد اور دہیان سے کم زمانہ خدا تعالےٰ کی یاد کا ہوتا ہے۔ جن جن چیزون کا ہمارے دل میں خیال اور دہیان رہتا ہے۔ سب سے کم زمانہ خدا کی یاد کے لئے ملتا ہے۔ چنانچہ مال کا دہیان بھی ہم کو بہت کچھ رہتا ہے۔ جان کا دہیان بھی اکثر رہتا ہے۔ اگر کوئی کسی کا نوکر ہے تو اوسکو آقا کا دہیان بھی اکثر اوقات رہتا ہے۔ بچوں کا دہیان بھی زیادہ رہتا ہے۔ مگر نہیں رہتا تو اللہ میاں کا دہیان نہیں رہتا۔ رات دن اُٹھتے بیٹھتے چلتے پھرتے دل میں یہ اُدہیڑ بن رہتی ہے۔ کہ مال یوں کمائینگے یوں بڑہائینگے۔ بچوں کے لئے فلاں فلاں چیز لائینگے نوکری میں کام اسطرح کرینگے۔ آقا کو یوں کارگذاری دکھائینگے وہ خوش ہوگا یوں ہماری عزت ہوگی۔ غرض کسیوقت دل اس سے خالی نہیں رہتا۔ میں پوچھتا ہوں کہ آخر یہ کیا بیہودہ شغل ہے۔ میاں نوکری کے کام سے تو روپے ملیں گے۔ لیکن یہ بتلاؤ کہ اس خیال سے کیا ملتا ہے اس سے کتنے روپے ملتے ہیں۔ کچھ بھی نہیں۔ مگر باینہمہ ان خیالات سے کوئی خالی نہیں۔ یہ اس بات کا جواب ہے۔ کہ لوگ کہتے ہیں۔ کہ اگر ہر وقت یاد خدا میں رہیں تو دنیا کا کام کیسے ہو۔ آخر کہانا بنانا رہنا سہنا یہ کام بھی تو کرنے ہیں۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ سب کام چھوڑ کر بس یاد خدا میں لگ جائیں۔ جواب کا حاصل یہ ہے کہ دُنیا کے کاموں کو منع نہیں کیا جاتا۔ جو کام دُنیا کی معیشت کیلئے ضروری ہیں اونکو کوئی منع نہیں کرتا۔ میرا اعتراض اسپر ہے۔ کہ دُنیا کے کام میں تو وقت صرف ہوتا ہی ہے۔ وہ تو ضروری ہے۔ جتنا وقت انہیں صرف ہو اوسکا مضائقہ نہیں۔ مگر اسکے علاوہ اوس کام کے خیال اور ادہیڑ بن میں کیوں وقت صرف کیا جاتا ہے۔ دل کو فارغ کیوں نہیں رکھا جاتا۔ اور اس وقت کو خدا کے دہیان اور خدا کی یاد میں کیوں صرف نہیں کیا جاتا۔ دُنیا کے کاموں کی جو ضرورت بیان کیجاتی ہے۔ تو ان میں کام کی ضرورت ہے نہ کہ خیال کی۔ سو کام کو منع نہیں کیا جاتا۔ بلکہ خیال کو منع کیا جاتا ہے۔ دُنیا کا کام تو کام کرنے سے ہوتا ہے۔

خیال سے تھوڑا ہی ہوتا ہے۔ تو خیال محض فضول چیز ٹھہری۔ بس اس فضول چیز سے منع کیا جاتا ہے۔ خیال تو محض بیکار ہے۔ اس سے تو نفع کچھ بھی نہیں۔ ہاں کچھ نقصان ضرور ہے۔ خیال کی حالت شیخ چلی کی کہانی کی سی ہے۔ کہ وہ ایک شخص کا شیرہ کا گھڑا سر پر لیکر چلے۔ دو پیسے مزدوری کے ٹھہرے۔ راستہ میں آپ نے خیال باندھا کہ ان دو پیسے کے دو انڈے خرید ینگے۔ پھر اونکو مرغی کے نیچے رکھیں گے۔ ایک میں مرغی ایک میں مرغا بچہ نکلے گا۔ وہ بڑے ہونگے پھر اونسے بہت سے انڈے ہونگے۔ پھر ان سب کے نیچے نکلوالیں گے۔ ان بچوں کو بیچکر بکریاں خرید ینگے۔ پھر اونکے بچے ہونگے اونہیں بیچکر بیل۔ پھر گھوڑے۔ پھر ہاتھی خرید ینگے اوران سب تجارتونکے بعد ہم مالدار ہوجاوینگے۔ پھر وزیر زادی سے نکاح کرینگے۔ اوس سے لڑکا ہوگا۔ وہ سیانا ہوکر ہم سے پیسہ مانگے گا۔ تو ہم کہیں گے ہشت یہ جو کہا تو اونکا سر ہل گیا۔ اور مٹکا گر گیا شیرہ سب بہ گیا مالک ساتھ تہا وہ بہت خفا ہوا۔ کہ میاں یہ کیا کیا۔ میرا نقصان ہوگیا۔ کہنے لگے جا اپنا کام کر۔ تیرا تو روپیہ دھیلی کا نقصان ہوا ہوگا۔ یہاں سارا بنا بنایا کنبہ غارت ہوگیا۔ حضرت خیال یہ چیز ہے کہ اس سے حاصل تو کچھ بھی نہ ہوا۔ ہاں یہ نقصان ضرور ہوا کہ ایک شخص کا گھڑا پھوٹ گیا اور شیرہ بہ گیا۔ صاحبو اسیطرح جس ادھیڑ بن اور خیال میں آپ رہتے ہیں اوس سے دنیا کا بھی تو کوئی نفع نہیں۔ کیونکہ دنیا کا نفع تو کام سے ہوتا ہے خیال سے کیا ہوتا ہے ہاں اتنا نقصان ضرور پہنچتا ہے کہ وہ وقت ضائع گیا اور یاد خدا سے محرومی رہی۔ خیال پر ایک معقولی کا قصہ اور یاد آیا۔ جنہوں نے خیال سے انڈے کے سو انڈے ذرا دیر میں بنادیئے۔ اور ہاتھ نہ آیا خاک بھی۔ ایک شخص کے دو لڑکے تھے۔ ایک گھر سے نکلکر معقول پڑہنے چلا گیا۔ اور مدتوں پڑہتا رہا۔ جب اس فن میں خوب کمال حاصل کرلیا۔ تو گھر لوٹکر آیا۔ باپ اور دونوں بھائی کھانا کھانے بیٹھے۔ ایک پیالہ میں دو انڈے سامنے لاکر رکھے گئے۔ آپ کو معقول کا جوش تھا۔ کہنے لگے دیکھو یہ پیالہ میں دو انڈے رکھے ہیں ہمکو ہم معقول کے زور سے ابھی سو کے دیتے ہیں۔ باپ نے کہا کرو۔ آپ بولے دیکھو ایک یہ انڈا ہے اور ایک یہ دو ہوئے اور ایک انکا مجموعہ تین ہوئے۔

پھر تین یہ اور ایک تینوں کا مجموعہ۔ چار ہو گئے۔ پھر چار یہ اور ایک چاروں کا مجموعہ۔ پانچ ہوئے اسی طرح انھوں نے سو تک تعداد بڑھا کر دکھادی۔ اور اپنے نزدیک بڑا کمال کیا۔ اسمیں دیر بھی لگی۔ کیونکہ اچھا خاصا عمل کرنا پڑا اور سمجھانا پڑا۔ اگر اس تقریر کا جواب ایسا ہوا کہ اسمیں ذرا دیر بھی نہ لگی جو بالکل اسکا مصداق تھا کہ سو سُنار کی اور ایک لوہار کی۔ باپ نے کیا کیا کہ وہ دونوں انڈے اٹھاکر ایک اپنے مُنہ میں رکھ لیا۔ اور ایک دوسرے بیٹے کے حوالہ کیا۔ اور کہا مولوی صاحب یہ دو انڈے تو ہم لئے لیتے ہیں۔ اور ۹۸ جو بچے وہ آپ کھا لیجئے۔ معقولی صاحب منہ دیکھتے رہ گئے گو یہ کہہ سکتے تھے۔ کہ سو انڈے جو بن گئے تھے ان میں کے ۹۸ انہی دو کے ساتھ تھے۔ کیونکہ وہ انتزاعی تھے اور انکا منشاء انتزاع یہی دو تھے۔ جب یہ تمہارے پیٹ میں اُتر گئے۔ تو وہ سب بھی تمہارے ہی پیٹ میں اُتر گئے۔ مگر اس جواب سے معقولی کا انڈا تو نہ ملتا۔ تو خیال کی یہ حقیقت ہے۔ کام تو خیال سے کوئی بھی نہیں بنتا۔ تو محض خیال ایک فضول چیز ہوئی اس سے منع کیا جاتا ہے۔ کام جو کچھ بنتا ہے وہ تو کام کرنے سے بنتا ہے۔ اس سے منع نہیں کیا جاتا۔ جو کام دُنیا کا آپ کو کرنا ہے کرو۔ مگر اوسکی اودھیڑ بن میں ہر وقت کیوں رہتے ہو۔ بلکہ کام کرنے کا جب وقت آیا اوس کام کو طریقہ کے موافق کیا اور قلب کو فارغ کر لیا۔ بتاؤ اسمیں کیا تنگی ہوئی۔ اور کونسا کام معیشت کا بند ہوا۔ یہ جو حالت ہے کہ رات دن عورت کا خیال۔ بچوں کا خیال۔ نوکری کا خیال۔ دوستوں کا خیال۔ کسی وقت ان سے فرصت نہیں ہوتی۔ یہ حالت کیوں ہے حتے کہ نماز بھی ان خیالات سے خالی نہیں ہوتی۔ ذرا یہ تو سوچو کہ یہ سارے کام نماز کے اندر تو ہونے ہی کے نہیں۔ جو کچھ ہوگا نماز کے بعد ہوگا۔ پھر دل انکی اودھیڑ بن میں کیوں رہتا ہے۔ پھر اگر آپ سے یوں کہا جاتا ہے کہ خیالات سے دل کو خالی رکھا کرو۔ تو کیا بیجا کہا جاتا ہے یہ جو نماز میں اول سے آخر تک دل میں خیالات بھرے رہے انسے کونسا کام بنا۔ پھر دل کو کیوں خراب کیا۔ لیکن کیا کیا جائے کہ ہم لوگوں نے انکی ایسی عادت ڈال لی ہے۔ جیسے تمباکو کھانے والوں کی تمباکو کی عادت ہو جاتی ہے کہ بدوں تمباکو کے چین ہی نہیں آتا۔ مُنہ خالی ادھار ادھار اسا معلوم ہوتا ہے۔ وہی

حالت ہماری ہے کہ جبتک دل میں یہ خیالات نہ ہوں بیچینی رہتی ہے۔ اور دل خالی خالی سا معلوم ہوتا ہے۔ اگر یہ بھی ہوتا کہ دو ایک چیزوں کا خیال ولمیں رہا کرتا۔ تب بھی کچھ تسلی رہتی۔ لیکن حالت یہ ہے کہ دُنیا بھر کے بکھیڑے اور خیالات موجود اور غیر موجود اور فرضی اور اختراعی ہر وقت دِل میں بھرے رہتے ہیں۔ کیا خراب زندگی ہے۔ سارا دن اور ساری رات ان ہی فضولیات کے ساتھ مشغولی رہتی ہے۔ جو کام کی بات ہے اوسکا گذر بھی دل میں نہیں ہوتا۔ وہ کام کی بات کیا ہے۔ اللہ کی یاد۔ اللہ کا خیال یہ کسی وقت آتا ہی نہیں۔ اور جو کبھی آتا ہے۔ تو چشم زدن کے واسطے اور ذرا دیر کے بعد پھر وہی۔ بقول مولانا ؎

گہ خیال اسپاؤ باغ وراغ + گہ خیال میغ و ماغ دیغ ولاغ

اگر یہ کہا جائے کہ بلا خیال کے دنیا کا کوئی کام ہوتا ہی نہیں۔ اور کام انسان کے ہت ہے ہیں تو خیال سے بھی کوئی وقت خالی ہونا مشکل ہے چنانچہ کہا ہے ؎

ہر خیالِ صلح شان و جنگ شان + ہر خیال نام شان و ننگ شان

خیال کی مثال ایسی ہے جیسے دریا۔ اور دنیا کے کاموں کی مثال ایسی ہے جیسے کشتی۔ جسطرح کشتی دریا پر دوڑتی پھرتی ہے۔ اسیطرح تمام کام دنیا کے خیال پر چلتے ہیں۔ دریا نہ ہو تو کشتی نہیں چل سکتی۔ اسیطرح خیال نہ ہو تو کوئی کام نہیں ہو سکتا۔ تو خیال ضروری ٹہرا پھر یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہ آدمی دل کو خیالات سے خالی کرے۔ اسکا جواب یہ ہے۔ کہ ایک تو خیال ہوتا ہے مقرون بالفعل یعنی وہ خیال جو کسی کام کے کرنے سے ذرا دیر پہلے دلمیں پیدا ہوتا ہے۔ کام کے لئے یہ خیال تو ضروری ہے۔ اور یہ خیال مانع مقصود سے نہیں۔ اس سے منع نہیں کیا جاتا۔ مگر یہ خیال کام کے قریب ہوا کرتا ہے اور واقعی بدوں اسکے کام نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ کام فعل اعضاء کا ہے۔ اور اعضا تابع ہیں قلب کے جبتک قلب میں ارادہ نہ ہو۔ اعضاء فعل نہیں کر سکتے۔ اور قلب میں ارادہ جب پیدا ہوتا ہے جبکہ اول اس فعل کا خیال پیدا ہوتا ہے تو خیال کا قلب میں پیدا ہونا ہر فعل سے پہلے ضروری ہوا۔ پس یہ تو مسلم ہے کہ ہر کام سے پہلے خیال کیضرورت ہے۔ لیکن اس سے

یہ ثابت نہیں ہوتا کہ قلب میں ہر وقت خیال کے رہنے کی ضرورت ہے۔ کیونکہ خیال کیضرورت فعل کے لیئے ہے۔ اور فعل ہر وقت نہیں ہوتا۔ کوئی وقت ایسا بھی تو نکلتا ہے۔ جو فعل سے خالی ہو۔ سو اوسوقت قلب بھی خیال سے خالی ہونا چاہیئے۔ یہ جو ہماری عادت ہے کہ ہر وقت دل میں خیالات بھرے رہتے ہیں۔ قطع نظر اس سے کہ کوئی کام کرنا ہو یا ہو۔ گذری ہوئی باتوں کے تصور۔ فرضی خیالات آیندہ کی لمبی چوڑی بے ضرورت باتیں دمیں بھری رہتی ہیں۔ یہ ضرور روکنے کے قابل ہیں۔ اور یہ ضرور دل سے بالکل بھلا دینے کی چیز ہے۔ جسکے ہم لوگ عادی ہو رہے ہیں۔ اور ہم کو اس سے ایسا انس ہوا ہے۔ کہ بلا اسکے چین ہی نہیں آتا۔ کسی وقت خالی بیٹھے ہوں تو وحشت ہوتی ہے۔ اور فوراً دلکو اوسکے ساتھ مشغول کر لیتے ہیں۔ حیرت کی بات ہے کہ وہ چیز جو یاد رکھنے کی تھی جس سے کسیوقت دلکو خالی نہیں ہونا چاہیئے (وہ کیا ہے۔ یاد حق) اسکو تو ہم لوگ یوں بھول گئے ہیں کہ اوسکے لئے وقت ہی نہیں ملتا۔ بلکہ ذہنوں سے اوسکی ضرورت ہی جاتی رہی اور وہ چیز جو بھلا دینے اور مٹا دینے کی تھی۔ اور صرف ضرورت کے لیئے اوسکی اجازت ہو سکتی تھی اوسکو ہم لوگوں نے ایسا یاد کیا ہے۔ کہ بلا اوسکے چین ہی نہیں آتا۔ صاحبو ذرا غور سے کام لیجئے۔ یہ مانا کہ خیال کسیوقت ضروری چیز ہے۔ لیکن ہر وقت اوسمیں مشغول رہنا یہ کیسے روا ہے۔ اسکی مثال تو ایسی ہوئی جیسے پاخانہ میں جانا۔ اس سے کوئی انکار نہیں کر سکتا کہ یہ بھی ضروری چیز ہے۔ لیکن کوئی یوں کرے کہ ایک دفعہ کی جگہ دو دفعہ پاخانہ میں جاسکے۔ ایک دفعہ تو رفع ضرورت کیلئے۔ اور ایک دفعہ وہاں کا مزا لینے کے لیئے کہ وہاں بیٹھکر یہ دیکھے کہ ایسی لینڈی ہے۔ ایسا قدمچہ ہے ایسی موری ہے۔ ایسے گجر گجر کیڑے اوسمیں چل رہے ہیں۔ فرمایئے یہ کیسا ہے۔ آپ ایسے شخص کو منع کرینگے یا نہیں اور دوبارہ پاخانہ میں جانیسے اُسے روکینگے یا نہیں اور اگر آپ منع کریں تو کیا وہ اسکا یہ جواب دیسکتا ہے کہ میاں تم پاخانہ میں جانیسے منع کرتے ہو پاخانہ میں جانا تو ضروری چیز ہے تو آپ یہی کہیں گے کہ ارے کمبخت پاخانہ میں جانا تو ضروری چیز ہے مگر اسکو ہر وقت سونگھنا کیا ضرورت ہے پاخانہ میں جانا جس ضرورت کے لئے ہے وہ تو ایک دفعہ میں پوری ہو چکی۔ اب دوبارہ جانا اس بات کی

دلیل ہے کہ رفع ضرورت مقصود نہیں۔ کچھ پاخانہ سے طبیعت مانوس ہی ہے۔ اور وہ اچھا لگتا ہے۔ صاحبو! ایسے ہی یہ بھی حماقت ہے کہ آدمی دل کو ہر وقت خیالات میں مشغول رکھے۔ یہ مانا کہ خیال ضروری چیز ہے۔ لیکن اوسکو اوسی حد تک تو ضروری کہہ سکتے ہیں۔ جس حد تک اوسکو رفع ضرورت میں دخل ہے۔ جسکی وجہ سے وہ ضروری ہوا۔ اور وہ وہی مرتبہ ہے۔ جسکو میں نے خیال مقرون بالفعل کہا ہے۔ اس سے زیادہ اوس میں مصروف رہنا ایسا ہی ہے۔ جیسے بجائے ایک دفعہ کے دو دفعہ پاخانہ میں جانا۔ اور اس سے مزہ لینا۔ اگر حس ہو تو ان خیالات سے ایسے ہی نفرت ہو جائے۔ جیسے لطیف الطبع آدمی کو پاخانہ کا خیال آجاوے۔ تو اسکو قے آنے لگتی ہے۔ صاحبو! اصل غذا قلب کی ذکر اللہ ہے۔ جو چیز اس سے مانع ہو۔ اسکو قلب سلیم ایسا ہی سمجھتا ہے۔ جیسے پاخانہ کو کہ اوسکے تصور سے بھی نفرت ہوتی اور قے آتی ہے۔ خصوصاً معاصی کے خیالات کہ وہ تو بالکل ہی گندی چیز ہیں۔ وہ تو سچ مچ پاخانہ کی برابر ہیں۔ بلکہ اس سے بھی زیادہ گھن کی چیز ہیں ان گندے خیالات کا تو ذکر ہی نہیں۔ یہ تو ان خیالات کا ذکر ہو رہا ہے۔ جو کہ معصیت نہ ہوں مگر غیر ضروری ہیں۔ جب یہ بھی ہیں تو خیالات معصیت تو مفرز ہر ہیں۔ غرض ضروری خیالات کو منع نہیں کیا جاتا۔ ہاں غیر ضروری سے ضرور روکا جاتا ہے۔ کیونکہ یہ مانع ہیں ذکر اللہ سے۔ دیکھئے کسیکو طلب معاش کے لئے کچہری جانا ہوتا ہے۔ یہ ضروری کام ہے۔ پھر وہاں کچہری کے کاموں میں اور اونکے خیالات میں مصروفیت رہتی ہے۔ یہ بھی ضروری ہے اور ان دونوں سے منع نہیں کیا جاتا۔ لیکن کچہری میں چھ ہی گھنٹہ تو رہنا ہوتا ہے۔ ان چھ گھنٹوں میں مصروفیت سہی۔ باقی ۱۸ گھنٹے کیوں خراب کئے ان میں مصروفیت کیوں رہتی ہے۔ ان میں دلکو فارغ کیوں نہیں رکھتے۔ ان گھنٹوں میں قلب کو خیالات سے پُر رکھنے کی کیا وجہ ہے۔ بتلائیے یہ زائد از کار اور فضول ہے یا نہیں۔ بس اسی پر ہمارا اعتراض ہے۔ کہ اس فاضل وقت میں قلب کے اندر خیالات کیوں بھرے رہتے ہیں۔ پھر اکثر خیالات بھی کسی امر مباح کے نہیں۔ بلکہ ناجائز اور حرام چیزوں کے۔ کہیں اجنبی عورت کو سوچ رہے ہیں۔ کہیں حرام خوری کی تجویزیں

کر رہے ہیں۔ کہیں شہوت کے ذرائع سوچ رہے ہیں یہ ۸ گھنٹے بھی اسی شغلہ میں گزر جاتی ہیں۔ ۸ گھنٹے جو کچہری میں رہتے ہیں اسکی نسبت تو کہا جاتا ہے کہ ضروری ہے خیر یہ ضروری سہی مگر ۸ گھنٹے جو ان فضول شغلوں میں گذار دیئے۔ جس سے ۲۴ گھنٹے پورے ہو گئے۔ یہ کونسے ضروری کام میں صرف ہوئے۔ کسی میں بھی نہیں۔ پھر خدا کی یاد کے واسطے کونسا وقت رہا۔ کوئی بھی نہیں۔ کچھ وقت ضروری مشغلوں میں گیا۔ اور کچھ غیر ضروری بلکہ مضر اور معصیت میں میزان پوری ہو گئی۔ دن رات کے ۲۴ گھنٹے ختم ہو گئے۔ پھر ایک دن ختم ہوا۔ دوسرا ختم ہوا تیسرا ختم ہوا اسیطرح یہ سلسلہ جاری رہا۔ اور ساری عمر ختم ہو گئی۔ شاید ذکر اللہ کا وقت مرنے کے بعد آئیگا۔ تو صاحبو! سمجھ لیجئے کہ مرنے کے بعد ذکر اللہ کا وقت نہیں آئیگا۔ اوسوقت تو حسرت اور افسوس کرنے کا وقت آئے گا۔ مگر اسوقت کی حسرت اور افسوس سے کچھ فائدہ نہ ہوویگا۔ اگر یہ بھی ہوتا کہ خیر وقت ضائع گیا گیا۔ کچھ اوسکا وبال آئندہ کے لئے نہ رہتا۔ تو چنداں ملامت نہ تھی۔ مگر یہاں تو معاصی کے خیالات میں وقت صرف ہوا ہے۔ جسکا وبال آئندہ کے لئے باقی ہے جس سے پیچھا چھوٹنا مشکل ہے۔ ذکر اللہ سے محرومی رہی۔ اور وبال اور عذاب سر رہا۔ نہایت افسوس کی حالت ہے۔ یہ ان لوگونکی حالت ہے۔ جو شریعت کا نام لیتے ہیں۔ اور گناہ سے پرہیز رکھتے ہیں۔ اور چاہتے ہیں کہ ہم شریعت کے تبع رہیں۔ کہ انکی نظر بھی صرف ظاہر ہی تک پہونچتی ہے۔ حالانکہ حق تعالے باطن کو بھی دیکھتے ہیں۔ اگر کسی نے ظاہری صورت درست کر بھی لی تو کیا ہوا۔ اصل درستی تو باطن کی ہے۔ صرف ظاہری درستی کی حالت تو یہ ہے ؎

از بروں چوں گور کافر پر حلل ۔ واندروں قہر خدائے عزوجل
؎ از بروں طعنہ زنی بر بایزید ۔ وزدرونت ننگ می دارد یزید

یہ وہ حالت ہے کہ دیکھنے والے تو سمجھتے ہیں بڑے دیندار ہیں۔ متشرع ہیں پرہیز گار ہیں۔ اللہ والے ہیں اور حقیقت میں نہ دیندار ہیں نہ متشرع۔ معاصی سے دل بھرا ہوا ہے اس دل میں اللہ کی یاد کہاں۔ حیف ہے کہ صورت ایسی اور سیرت ایسی۔ کہلاتے ہیں اللہ والے۔ اور اللہ کے نام کا وہاں گذر ہی نہیں۔ اللہ کی یاد کسی وقت بھی دلمیں

نہیں۔ دوسری ہزاروں چیزیں دلمیں بھری ہوئی ہیں۔ یہ تحقیق تھی امر ثانی یعنی تعلق مع اللہ کی۔ جو کہ اصل ہے۔ جسکا حاصل ہو اللہ کی یاد۔ اب رہا دوسرا امر یعنی امراض باطنہ کی تحقیق۔ سو سمجھنا چاہیئے کہ گو امراض بیشمار ہیں۔ لیکن اون سب کی اصل مشاہدہ و تجربہ سے صرف ایک ہے۔ یعنی غفلت عن اللہ جو کہ اوس تعلق مذکور کی ضد ہے۔ اور اسی سے جوڑ سمجھ میں آگیا ہوگا۔ اون دونوں امروں میں۔ یعنی اصل چیز ہے تعلق مع اللہ جب یہ نہ ہوگا تو اسکی ضد یعنی غفلت ہوگی اور وہ اصل ہے جمیع امراض باطنہ کی۔ پس تعلق مع اللہ کے احکام و آثار معلوم ہونے سے تمام امراض کی تحقیق ہو گئی۔ اور یہ بھی معلوم ہو گیا۔ کہ خود غفلت اور امراض میں بھی علاقہ اصل و فرع کا ہے۔ یعنی ان دونوں میں ایک اصل ہے اور ایک فرع۔ اصل کیا ہے۔ غفلت۔ اور فرع کیا ہے باقی امراض۔ یعنی غفلت ہی منشا ہے جملہ امراض کا۔ تو اور امراض سے پہلے اسکے علاج کی طرف توجہ ضروری ٹھہری۔ اور معلوم ہے کہ علاج بالضد ہوا کرتا ہے۔ اور غفلت کی ضد ہے یاد۔ تو یاد کو اختیار کرنا چاہیئے۔ اور یاد سے مراد کسی لفظ کو زبان سے رٹنا نہیں ہے۔ کیونکہ صرف لفظ زبان پر لانے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ دیکھو لڈو میٹھی چیز ہے۔ لیکن لڈو لڈو زبان سے رٹنے سے کبھی منہ میٹھا نہیں ہوگا۔ خواہ ساری عمر اسی میں گذر جاتی اسی کی نسبت کہا ہے ؎

میم و واؤ و میم و نون تشریف نیست ✦ لفظ مومن جز پے تعریف نیست

مومن کا لفظ زبان سے کہہ لینے سے آدمی مومن نہیں ہو جاتا۔ جیسا کہ لڈو کا لفظ زبان سے کہنے سے منہ میٹھا نہیں ہو جاتا۔ منہ میٹھا جب ہی ہوگا۔ جب بجائے لفظ اور اسم کے لڈو کا مسمے منہ میں آئے گا۔ معلوم ہوا کہ خالی الفاظ کافی نہیں ہوتے۔ اسیواسطے کہا ہے کہ میم و واؤ و میم نون کہنے سے مومن نہیں ہوتا۔ اور فرماتے ہیں ؎

مست و لا یعقل نہ از جام ہو ✦ اے ز ہو قانع شدہ بر نام ہو

یعنی تو خدا کا نام صرف زبان سے لیتا ہے۔ اور اسیپر قناعت کئے ہوئے ہے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ تو ابھی جام محبت سے سرشار نہیں ہوا ہے۔ ورنہ مست اور مدہوش ہو جاتا۔

تونے صرف لفظ کو رٹا ہے۔ اسلئے جو حالت محبت والے کی ہوا کرتی ہے وہ نہیں پیدا ہوئی۔ وہ نشہ اسلئے سوار نہ ہوا۔ کہ تونے صرف نام سیکھا ہے اور کام نہیں کیا۔ اور اوس نے علاقہ نہیں پیدا کیا۔ تجھکو محبت والا اور عاشق اور اللہ والا کیسے کہا جاوے۔ اگر صرف الفاظ کافی ہوا کریں۔ تو الفاظ کے درجہ میں تو شیخ چلی نے بھی شادی کرلی تھی۔ اور بچے بھی ہوگئے اور وہ ایک منٹ میں غارت بھی ہوگئے۔ اور نرے خیال کی دوسری مثال یہ سنو! ایک طالب علم سے اونکے دوست نے پوچھا۔ آجکل کیا شغل ہے۔ کہنے لگے یہاں کی شہزادی سے نکاح کرنے کی فکر میں ہیں۔ اون دوست نے پوچھا پھر کیا ہوا۔ کہنے لگے کہ آدھا سامان تو ہوگیا۔ آدھا نہیں ہوا۔ پوچھا کیسے۔ کہنے لگے کہ ہم تو راضی ہیں وہ راضی نہیں۔ مطلب یہ کہ نکاح کے دو جزو ہیں ایجاب اور قبول ہم ایجاب کرنے کو تیار ہیں۔ اوسکے قبول کی دیر ہے۔ کیا اس خیال باندھ لینے سے شہزادی مل گئی۔ نرے قال اور نرے خیال کی بس ایسی ہی مثال ہے۔ حاصل یہ ہے کہ نرا خیال کافی نہیں ہے ہاں یہ دوسری بات ہے۔ کہ خیال بھی بیکار چیز نہیں۔ اس سے یہ فائدہ ہے۔ کہ اسکی مزاولت سے استحکام ہوجاتا ہے۔ چنانچہ اول ہر کام کا خیال ہی پیدا ہوتا ہے پھر کام شروع ہوتا ہے۔ پھر اوس شروع کے بعد تکمیل ہوتی ہے۔ پھر اوس تکمیل پر نتیجہ اور غایت کا ترتب ہوجاتا ہے جیسے نکاح کہ اول دل میں خیال پیدا ہوتا ہے پھر اوسکے ذرائع اختیار کئے جاتے ہیں۔ پیغام دیا جاتا ہے۔ طرفین سے رضامندی ہوجاتی ہے۔ پھر ایجاب وقبول ہوجاتا ہے۔ بس نکاح کا وجود ہوگیا۔ پھر خدا نے چاہا تو توالد وتناسل ہوتا ہے۔ یا کاشتکاری ہے کہ اول خیال پیدا ہوتا ہے۔ پھر زمین تلاش کیجاتی ہے پھر معاملہ طے کرلیا جاتا ہے اور کام شروع کردیا جاتا ہے۔ پھر اوسکی تکمیل پر پیداوار ہوجاتی ہے۔ تو خیال بھی ایک درجہ میں مفید چیز ضرور ہے۔ مگر اسکے مفید ہونے میں یہی شرط ہے کہ مقرون بالعمل ہوجاوے۔ یعنی خیال وہی مفید ہے۔ جسکے بعد کام بھی شروع کردیا جاوے بلفظ دیگر خیال مقصود بالذات چیز نہیں۔ بلکہ ذریعہ ہے مقصود کا۔ اور ذریعہ اسیوقت کارآمد ہوتا ہے۔ جبکہ مقصود کے حاصل کرنے کے لئے استعمال کیا جاوے مثلاً سیڑھی

کہ ذریعہ ہے چھت پر چڑھنے کا۔ تو سیڑھی کا بنانا درست ہے۔ اور ضروری ہے۔ لیکن اسی
شرط سے کہ چھت پر چڑھنے کے لئے کام میں لائی جائے۔ نہ یہ کہ سیڑہی بنا کر احتیاط سی
گھر میں رکھ لیجائے۔ اور اوسکو مقفل کر دیا جائے اور کبھی اوسکو استعمال نہ کیا جائے۔ یا
بہت سی سیڑھیاں بے ضرورت بنا بنا کر گھر میں رکھ لیجاویں۔ علےٰ ہذا خیال بھی گو کارآمد
چیز ہے۔ مگر خود مقصود بالذات نہیں۔ بلکہ ذریعہ ہے کام کا۔ تو اوسی درجہ تک اسکو اختیار کرنا
چاہیئے۔ جس درجہ تک کام کے وجود میں اوسکو دخل ہے۔ اور اوسکا معیار یہ ہے۔ کہ
وہ مقرون بالعمل ہو۔ دیکھئے کاشتکاری کا خیال پیدا ہوتا ہے یہ مفید ہے۔ لیکن
اسیوقت جبکہ اسکے بعد کام شروع کر دیا جائے۔ زمیندار سے کاغذ پٹہ لکھوایا جائے
بیج بہم پہنچایا جائے۔ بیل خریدے جائیں۔ پانی دینے کا انتظام کیا جائے۔ تخم ریزی
کیجائے۔ پھر جب کھیتی پیدا ہو جائے۔ تو اوسکی حفاظت کا سامان کیا جائے۔ اب امید
ثمرہ کی ہوگی۔ تو یہ خیال مفید ہوا۔ مگر اسی وجہ سے کہ مقرون بالعمل ہو گیا۔ اور اگر صرف
خیال ہوتا۔ یعنی اوسکے بعد عمل نہ شروع ہوتا۔ تو بیکار تھا۔ گو تمام عمر اسی میں گذر جاتی۔
غرض خیال کارآمد اسیوقت ہے کہ بعد اوسکے عمل بھی ہو۔ اور یہ بھی یاد رہے۔
کہ عمل جب ہو سکتا ہے جب علم ہو اور علم حاصل ہو سکتا ہے سیکھنے سے اور کسی کا
اتباع کرنے سے تو حاصل یہ ہوا کہ خیال اوسوقت مفید ہے۔ کہ اوسکے ساتھ عمل اور
اتباع کسی محقق کا ہو ہر خیال کی یہی حالت ہے۔ پس اسی طرح اللہ کا خیال بھی ہے۔
کہ وہ جب مفید ہے کہ کام بھی شروع کر دیا جائے۔ اور یہ نہ ہو تو نرے خیال سے مقصود
حاصل نہیں ہوتا۔ وہ مقصود کیا ہے۔ تعلق مع اللہ۔ جو صرف یاد سے حاصل ہوتا ہے۔
کیونکہ یاد اور خیال میں فرق ہے۔ خیال تو وہ ہے جو شیخ چلی نے باندھا تھا۔ اور یاد
وہ ہے۔ جو دن رات آپکے محاورات میں موجود ہے۔ آپکے دوست کا خط آتا ہے
کہ میاں تم نے تو ہم کو بھلا دیا۔ کبھی ملتے نہیں۔ خط نہیں بھیجتے۔ کبھی ہم کو بلاتے نہیں۔
کیا آپ اسکے جواب میں یہ کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہم نے بھلایا نہیں ہے۔ ہر وقت تمہارا خیال
دل میں رہتا ہے۔ اس جواب کو کوئی تسلیم نہیں کریگا۔ بات کیا ہے! وہی۔ کہ خیال کو

یاد نہیں کہتے۔ خیال اور یاد میں فرق ہے۔ مجھے اسکی شرح کرنیکی اور فرق بتلانے کی ضرورت نہیں۔ اس مثال سے بخوبی سمجھ میں آگیا ہوگا۔ کہ دونوں میں فرق ہے ثابت ہوا کہ خدا کے اس خیال میں جسکو تصور کہتے ہیں۔ اور اسمیں جسکو یاد کہتے ہیں فرق ہے اور حکم کیا گیا ہے یاد کا۔ چنانچہ ارشاد ہے۔ اذکروا اللہ ذکراً کثیراً۔ تو مجرد خیال سے کام نہ چلیگا۔ بلکہ یاد کرنے کی ضرورت ہے۔ اور چونکہ یاد میں دوام کی ضرورت ہے۔ اسلئے یاد کرنے کی جگہ یاد رکھنے کا لفظ زیادہ موزوں ہوگا۔ تو معنے یہ ہوئے کہ حق تعالےٰ کو یاد رکھو اور بہت یاد رکھو۔ یعنی کسیوقت مت بھولو۔ اور جیسی طرح دوست کے یاد رکھنے کے یہ معنی ہیں۔ کہ ہر کام میں اوسکو یاد رکھو۔ جسکی علامت یہ ہے۔ کہ کوئی کام اونکے خلاف مرضی نہ کرو۔ اسیطرح یاد حق کے معنے سمجھو۔ اسی کو خیال مقرون بالعمل کہا جاتا ہے۔ دیکھو! اذکروا اللہ کے بعد وسبحوہ بھی ہے۔ کیا معنے کہ صرف ذکر ہی پر کفایت نہ کرو۔ تسبیح بھی کرو۔ ظاہر ہے کہ تسبیح از جنس عمل ہے۔ تو یہ معنے صاف طور سے نکل آئے کہ خیال مقرون بالعمل ہونا چاہیئے۔ تو خدا کا خیال وہی معتبر ہوا۔ جسکے ساتھ عمل بھی ہو۔ جب یہ حالت ہے۔ تو یہ بات کیسے مان لیں۔ کہ خدا تعالےٰ کی یاد یا خیال ہمارے دلمیں ہے۔ جبکہ اوسکے ساتھ عمل نہیں۔ ایسی یاد تو غفلت ہی میں داخل ہے اور یہی غفلت اصل ہے تمام معاصی کی۔ جسکو میں نے اوپر بھی عرض کیا ہے حضور صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے یہاں اسی غفلت کو ذکر فرمایا ہے۔ کیونکہ مقصود علاج ہے اور اصل اور فرع میں سے علاج اصل ہی کا کرنا کافی ہوتا ہے جب اصل زائل ہو جاتی ہے۔ تو جو امراض اوسکی فرع ہیں۔ وہ خود زائل ہو جاتے ہیں۔ چنانچہ ارشاد فرماتے ہیں۔ ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ۔ یعنی حق تعالےٰ وہ دعا قبول نہیں فرماتے۔ جو غافل دل سے نکلی ہو۔ اسمیں مذمت ہوئی غفلت کی جسکا میں نے اب تک بیان کیا ہے اسلئے اسکے مزید بیان کی تو حاجت رہی نہیں۔ اب صرف یہ سمجھنا رہ گیا۔ کہ غفلت کے چند درجے ہیں۔ بڑا درجہ تو یہ ہے کہ عین حالت طاعت میں بھی غفلت ہو۔ جیسی ہماری حالت ہے کہ اور اوقات میں تو غفلت ہے ہی۔ عین طاعت کے وقت بھی غفلت ہی رہتی ہے

سارا وقت غفلت ہی میں گذرتا ہے۔ مثلاً نماز پڑھ رہے ہیں اور یہ بھی خبر نہیں کہ ہم کس کے سامنے کھڑے ہیں۔ یہ بھی پتہ نہیں چلتا۔ کہ رکوع سجدہ کیسے کیا۔ کیا پڑھا اور کیا زبان سے دعا کی۔ چونکہ عادت پڑگئی ہے زبان سے الفاظ ادا ہو جانے کی اسوجہ سے قرأت اور تسبیح پوری ہو جاتی ہیں۔ ورنہ دل کو تو یہ بھی خبر نہیں ہوتی۔ کہ ہم کہاں ہیں۔ ذرا سوچنے کی بات ہے۔ کہ حاکم کا ادب تو یہ ہوتا ہے کہ حاکم اگر سامنے بھی نہ ہو۔ تب بھی ادب کیا جائے۔ چنانچہ حاکم کے مکان میں گھستے ہیں تو اوسکی ہیبت کا اثر یہ ہوتا ہے۔ کہ ہاتھ پیر کانپنے لگتے ہیں۔ قدم آگے کو نہیں بڑھتا۔ حالانکہ حاکم اسوقت اس مکان میں نہیں ہے۔ مگر یہ حالت ہوتی ہے۔ کہ اوس خالی مکان میں بھی اگر بیٹھتے ہیں تو چپکے بیٹھے رہتے ہیں۔ غل مچانے کی بلکہ بولنے کی بھی ہمت نہیں ہوتی۔ یہ تو حاکم کی غیبت میں حالت ہوتی ہے۔ اور جب حاکم سامنے ہوتا ہے تو اوسوقت تو کچھ نہ پوچھو کیا حالت ہوتی ہے۔ ہوش و حواس درست نہیں رہتے۔ بات مُنہ سے نہیں نکلتی۔ اگر حاکم ان سے بات کرنا چاہے۔ تو جواب کے لئے زبان کام نہیں دیتی۔ جب ایک ذراسے حاکم کا ادب اور ہیبت یہ ہے۔ تو خدائے احکم الحاکمین کا کیا ادب ہونا چاہیئے اور کیا ہیبت ہونی چاہیئے۔ حاکم سے تو غیبت بھی ہو جاتی ہے۔ خدا تعالےٰ سے تو غیبت بھی نہیں ہو سکتی۔ اسکا مقتضا تو ضروری یہ ہونا چاہیئے۔ کہ ہر وقت آدمی ڈرتا کانپتا رہے۔ معصیت تو بہت دور ہے۔ بولنا چالنا بھی بند ہو جانا چاہیئے۔ لیکن اگر ایسا ہوتا تو دنیا کے کام سب بند ہو جاتے۔ اسواسطے اس درجہ کی حضوری کا احساس کم کردیا گیا ہے۔ اور ایسا پردہ ڈالدیا گیا ہے۔ کہ باوجودیکہ ہم جانتے ہیں کہ خدا تعالےٰ حاضر ناظر ہیں۔ اور اُن سے کسیوقت غیبت نہیں ہو سکتی۔ لیکن اسکے مقتضا کے درجہ کا اثر نہیں ہوتا۔ اور وہ ادب اور ہیبت ہم پر طاری نہیں ہوتی۔ خیر اگر ہر وقت اور اسدرجہ تک بھی طاری نہ ہو۔ تاہم کسی وقت اور کسی درجہ میں تو اوسکا احساس ہونا چاہیئے۔ اگر ہیبت حضوری ہر وقت طاری نہیں ہوتی۔ تو غفلت دوری بھی تو ہر وقت طاری نہیں ہونی چاہیئے۔ کوئی وقت تو ایسا ہونا چاہیئے جسوقت غفلت محض نہ ہو۔ اور حضوری کے آثار پیدا ہوں۔ ایسا وقت وہی تجویز کرو جسوقت

ارادہ کر کے حضوری میں کھڑے ہوتے ہو۔ یعنی جسوقت طاعت میں مشغول ہوتے ہو۔ اوسوقت تو حضوری میں گذارو۔ اوسمیں تو آثار حضوری کے پیدا کرلو۔ نماز پڑہنے کھڑے ہوئے ہو۔ تو آموختہ سا تو نہ پڑہو۔ اُسوقت تو اتنا خیال کرلو کہ ہم کسی سے بات کر رہے ہیں اگر کسی معمولی آدمی سے بھی بات کرتے ہو تو اوسکی طرف مُنہ کر کے بات کرتے ہو اور اپنے الفاظ کو سمجھکر زبان سے نکالتے ہو۔ اور اسکے جواب کی طرف کان لگائے رہتے ہو۔ اور جو وہ کہتا ہے۔ اوسکو سمجھکر جواب دیتے ہو۔ اور اگر اوس مخاطب سے تم کو خاص محبت ہوتی ہے۔ تو اوس سے بات کرنے میں اور اسکا جواب سننے میں مزا آتا ہے۔ اور چاہتے ہو کہ بات کو جلدی نہ ختم کرے۔ جب ایک اپنے ہمجنس کے ساتھ یہ برتاؤ ہے تو سوچ لو خدائے احکم الحاکمین اور سلطان المحبوبین کے ساتھ کیا برتاؤ ہونا چاہیئے اور اسنے کسطرح بات کرنی چاہیئے۔ کیا اسکا یہی طریقہ ہونا چاہیئے کہ جب سامنے پہونچے۔ مُنہ پھیر کر تو کھڑے ہوگئے اور آموختہ سا یاد کر کے لے گئے تھے۔ وہ سب ایک سانس میں پڑہکر ختم کر دیا۔ یہ بھی پتہ نہ چلا کہ ہم نے کیا سُنایا۔ آموختہ بھی صحیح پڑہا گیا یا نہیں۔ پھر یہ انتظار ہے۔ کہ کہیں جلدی ختم ہو اور بھاگیں۔ میں پھر کہتا ہوں کہ کیا خدا سے بات کرنے کا یہی طریقہ ہونا چاہیئے ذرا انصاف کیجئے اور ذرا خدا سے ڈریئے۔ خدا سے غفلت کرنا یہی خدا کی طرف پشت کرنا ہے۔ نماز اس طرح پڑہنا کہ دل کہیں ہے۔ زبان سے الفاظ نکل رہے ہیں۔ یہی خدا کی طرف پشت کرنا ہے۔ کبھی تو دل میں یہ سوچنا چاہیئے کہ ہم کیا کر رہے ہیں غرض یہ غفلت کا بڑا درجہ ہے کہ طاعت کی حالت میں بھی غفلت ہو جسکو ہم بھی سمجھتے ہیں۔ کہ حضوری کا وقت ہے۔ حقیقت میں تو خدا تعالیٰ سے ہر وقت ہی حضوری ہے مگر خیر اور وقتوں کو چھوڑ اطاعت کے وقت تو غفلت نہ ہو۔

دوسرا درجہ غفلت کا یہ ہے کہ طاعت میں تو کچھ یاد ہو جاتی ہے۔ مگر اور وقت میں نہیں ہوتی۔ اسمیں وہ لوگ بھی مبتلا ہیں جو ذاکرین کہلاتے ہیں۔ انکو سمجھ لینا چاہیئے۔ کہ جسطرح زبان کا ایک شغل ہے۔ ایسے ہی قلب کا بھی ایک شغل ہے۔ یعنی زبان کا شغل ذکر لسانی ہے۔ اور قلب کا شغل ذکر قلبی۔ اور توجہ الی اللہ اور

خدا کی یاد اور خدا کا خیال۔ سو اکثر ذاکرین زبان کو تو مشغول ذکر رکھتے ہیں۔ لیکن دلکو
مشغول نہیں رکھتے۔ قلب کی غفلت میں یہ ذاکرین بھی مبتلا ہیں۔ اسلیئے انکو سمجھ لینا
چاہیئے کہ جیسے ذکر لسانی ضروری چیز ہے۔ ایسے ہی ذکر قلبی بھی ضروری چیز ہے۔ یعنی ہر وقت
قلب کو حق تعالےٰ کی طرف متوجہ رکھنا چاہیئے۔ ضرورت کے وقت دوسری طرف خیال
کر لینا جائز ہے لیکن بلا ضرورت غیر کا خیال نہ لاویں۔ یہ مشغلہ تو نہ رکھیں کہ ہر وقت دل
غیر اللہ ہی کے خیال میں لگا رہتا ہے۔ اس سے دل کو فارغ رکھنا چاہیئے۔ ضرورت کے
وقت اگر خیال کسی طرف ہٹ جاوے خیر۔ مگر اوسکے رفع ہونے کے بعد تو فوراً پھر
اسی طرف آجائیں۔ اس ضرورت کے وقت دوسری طرف خیال کی اجازت دیدینے
سے میں نے ساری دُنیا کو سنبھال لیا۔ اب کوئی یہ نہ سمجھے کہ مجھے ضروریات کا علم
نہیں ہے۔ صاحبو! مجھے بھی آپکی طرح ضروریات کا علم ہے۔ چنانچہ دیکھیئے اوس کی
کسقدر رعایت کر دی گئی۔ حاصل یہ ہے کہ اصل چیز ذکر اللہ کو سمجھو۔ غیر کا خیال اگر آوی
تو بضرورت۔ اور میں کہتا ہوں کہ اگر یہ عادت ہو جائیگی کہ غیر ضرورت کے وقت میں یعنی
دُنیا کے کاموں سے فراغت کے وقت میں خدا تعالےٰ کی یاد رکھو گے تو اسکا اثر
انشاء اللہ تعالےٰ یہ ہوگا کہ اس ضرورت کے وقت میں بھی یعنی دُنیا کے کاموں میں
مصروفیت کے وقت بھی خدا تعالےٰ کی یاد رہے گی۔ اور یہ بات پیدا ہو جائے گی۔
کہ ہر وقت اللہ ہی کی یاد دل میں بسی رہیگی۔ غیر اگر دل میں آویگا بھی تو اچٹتا اچٹتا۔
جب ایک مکان میں کرایہ دار کو بسا دیا۔ تو اب غیر آدمی اس مکان میں آتا ہے تو بطور
مہمان کے آتا ہے۔ مگر اب اوسکا الٹا ہو رہا ہے۔ کہ مکان پر تو غیر کا قبضہ ہو گیا ہے
کرایہ دار اگر آنا چاہتا ہے۔ تو اندر اپنا دخل نہیں کر سکتا۔ بطور دیکھنے والوں۔ اور
تماشائیوں کے آتا ہے۔ کہ ایک نظر ڈالی اور لوٹ گیا۔ اسلیئے ضرورت ہے کہ غیر کے
قبضہ سے مکان کو نکالو اور اوسمیں اللہ کو بسا لو۔ تاکہ دوسرا آوے تو ادب سے مہمان
داخل آوے۔ اور میری اس تقریر سے یہ بات بھی سمجھ میں آگئی ہوگی۔ کہ غیر سے
تعلق رکھنے کو مطلقاً منع نہیں کیا جاتا۔ تعلق کی اجازت دیجاتی ہے۔ مگر اتنا ہی تعلق

جتنا مہمان سے ہوتا ہے۔ یا جتنا تعلق ایک اجنبی سے ہوتا ہے۔ دیکھو ہمارے نوکر بھی گھر میں آتے ہیں مگر ادب سے آتے ہیں، مکان پر قبضہ کرتے نہیں آتے۔ اور نہ ہم پر حکومت کرتے آتے ہیں۔ پس غیر اللہ کو دل میں لاؤ مگر اس طرح لاؤ۔ میں یہ نہیں کہتا کہ غیر اللہ کو بالکل دل میں نہ لاؤ۔ ضرورت سے لاؤ مگر اجنبیانہ اور عارضی طور پر۔ اصل رہنے والا دل کے مکان کا اللہ میاں کو بنا لو۔ یہ فرق خوب یاد رکھنے کا ہے۔ کہ اللہ میاں میں اور غیر میں اصلی اور عارضی کا فرق رکھو۔ اب دیکھئے میں نہ دنیا چھوڑاتا ہوں۔ نہ کسی کام کو بند کرتا ہوں۔ کام سب کرو۔ مگر اصلی کام اپنا خدا کی یاد کو سمجھو۔ دوسرا کام کیا اور اپنے اصلی کام میں لگ گئے۔ اب ذرا غور کر کے دیکھ لیجئے کہ آپ کے دل کی کیا حالت ہے اللہ کی یاد میں اور غیر کی یاد میں جو فرق ہونا چاہیئے آیا اس میں یہی فرق ہے یا نہیں کہ اللہ کی یاد بطور اصلی رہنے والے کے ہے۔ اور غیر کی یاد بطور اجنبی آنے والے کے۔ اگر یہ فرق نہیں ہے۔ تو عنقریب ہی سر پکڑ کر رونا۔ ایک وقت وہ آئیگا جسوقت حسرت ہوگی کہ ایک جلسہ کو بھی خدا کی یاد سے خالی کیوں چھوڑا تھا۔ اسوقت اسکی تلافی کچھ بھی نہ ہو سکے گی۔ اگر میں دنیا کو اور غیر کے خیال کو چھوڑاتا تب تو آپ کے پاس عذر تھا اور اب کیا عذر ہے۔ میں تو کسی ضروری کام کو منع ہی نہیں کرتا۔ بس یہ کہتا ہوں کہ اصلی اور عارضی کا فرق رکھو۔ اللہ کی یاد کو غالب رکھو۔ اور غیر کی یاد کو مغلوب۔ وہی مثال نوکروں والی یاد کرو۔ گھر کے کاموں کے لئے نوکروں کا گھر میں آنا ضروری ہے۔ مگر انکا گھر پر قابض ہو جانا ضروری نہیں۔ نوکر نوکر کیطرح آویں گھر کے مالک بننے کو اور تم پر حکومت کرنے کو تو نہ آویں۔ یہ موٹی بات ہے۔ اس مثال کو خوب یاد کر لو۔ مالک اور قابض دل کا اللہ میاں کو بناؤ۔ اور غیر اللہ کو صرف نوکروں کی طرح آنے دو۔ اور یہ بات اختیاری ہے واللہ ثم واللہ اختیاری ہے کوئی یہ نہ سمجھے کہ ہم سے ایسا ہو نہیں سکتا۔ ہو سکتا ہے اور بہت آسانی سے ہو سکتا ہے۔ ہم لوگ توجہ نہیں کرتے اور اسکو ضروری نہیں سمجھتے۔ ورنہ بہت آسانی سے اسکا حاصل کرنا ممکن ہے۔ کر کے دیکھو اسکے بعد کہنا۔ یہ کیا مشکل ہے کہ یاد سب کی رکھو

مگر خدا کی یاد کو غالب کر لو۔ اگر اسکو بھی مشکل سمجھو تو ایک ڈنڈا سیڑھی کا اس سے نیچے اور ہے۔ وہاں ہی تک چڑھ جاؤ۔ اس سے بھی بام تک پہونچ جاؤ گے۔ وہ یہ کہ خدا کی یاد دل میں بساتے ہیں شاید یہ عذر ہو کہ خدا کو دیکھا نہیں ہے نہ بعینہ نہ بنظیرہ اور ایسی بے دیکھی چیز کی یاد بار بار آنا یا دل میں جمانا مشکل ہے۔ اور ایسی چیز کی یاد میں ابتدائً مزا بھی نہیں آتا۔ تو دل کیسے اوسکا خوگر ہو۔ سو میں اس عذر کا بھی جواب دیتا ہوں۔ اور ایک مزے دار چیز کا جسکی نظیر کو تم نے دیکھا بھی ہے۔ پتہ بتاتا ہوں اُسکی ہی یاد کیا کرو۔ وہ کیا ہے اپنا گھر۔ جنت جہاں سے تم دُنیا میں آئے ہو اسکو یاد کیا کرو۔ اسکی یاد تو مزے دار ہے اور اوسکی نعمتوں کے نظائر دیکھے ہوئے بھی ہیں۔ اونکا خیال جم بھی جائیگا۔ تم اوسکو ایک دفعہ بقصد و اہتمام دل میں لاوگے تو دل اوسکے مزے کی وجہ سے دس دفعہ اعادہ کا تقاضا کریگا۔ لیجئے اس میں تو بہت سہولت ہو گئی۔ اگر خدا کی یاد ویسے نہیں بستی ہے تو یوں چلو ابتدا اس سے کرو انتہا خدا کی یاد پر ہو جائیگی اسپر بھی شاید یوں کہا جائے کہ جنت بھی بہت دور ہے۔ کیونکہ وہ آخرت ہے۔ اور اوسکا دور ہونا ظاہر ہے۔ ذہن وہاں تک پہنچنے میں لنگڑاتا ہے۔ اس کا جواب یہ ہے۔ کہ تم کو دھوکا ہوا جنت کہ ایک مکان کا نام ہے دور نہیں۔ البتہ اوسکا ملنا کہ متعلق زمان کے ہے۔ ضرور دور ہے۔ پس زمان آخرت بیشک دور ہوا خدا جانے کتنی صدیاں ابھی باقی ہیں۔ مگر مکان آخرت دور نہیں ہے۔ وہ مکان آسمان پر ہے۔ اور یہ ثابت ہے کہ جنت موجود بالفعل ہے۔ وفی السماء رزقکم وما توعدون کے عموم میں وہ بھی داخل ہے۔ تو اب اسکے سوچنے میں تو کچھ دشواری نہیں یوں سوچا کرو کہ ہمارے سر کے اُوپر آسمان میں جنت ایک جگہ ہے۔ جو دُنیا سے کہیں اچھی ہے۔ دُنیا اوسکے سامنے کوئی چیز نہیں۔ اوسمیں حوریں ہیں محلات ہیں۔ اشجار ہیں۔ انہار ہیں۔ یہ ایسی چیزیں ہیں کہ انکا تصور آیا پھر دل اُنکو چھوڑنے ہی کا نہیں۔ اور بار بار یاد کریگا۔ اور انہیں زیادہ سوچنا بھی نہیں پڑیگا۔ کیونکہ سر کے اوپر موجود ہے بعید زمانی کا سوچنا البتہ مشکل ہوتا ہے۔ سو وہ

آخرت کا زمانہ گرچہ وہ بھی بہت بعید نہیں ہے کیونکہ جو چیز آنیوالی ہے۔ وہ ضرور آجاویگی۔ اُسکا بُعد قابل لحاظ نہیں ہوتا۔ مگر خیر وہ بعید سہی تم ایسی چیز کو سوچو۔ جو اسوقت بھی موجود ہے۔ صاحبو! دیکھیے کتنی آسانی ہوگئی۔ جب خالی میٹھو بجائے اسکے کہ اور فضول خیالات کے ساتھ دل کو مشغول رکھو یہ سوچا کرو۔ کہ ہمارے اوپر ایک مکان ہے جسکا نام جنت ہے۔ اوسمیں انگور ہیں حوریں ہیں۔ نہریں ہیں۔ طرح طرح کی نعمتیں ہیں۔ اس خیال سے شوق پیدا ہوگا۔ پھر یہ سوچو کہ ان چیزوں کے ملنے کا مدار اعمال پر ہے اعمال ہونگے تو یہ چیزیں ملیں گی۔ اور نہیں تو حسرت ہی حسرت ہوگی۔ اس سے ہمت پیدا ہوگی اور قلب اور اعضا مستعد ہوجاینگے اعمال کے لئے۔ جب اعمال ہونگے۔ تو خدا تعالےٰ کا وعدہ ہے جنت کیوں نہ ملے گی دیکھو کیسا سہل راستہ ہوگیا۔ کیونکہ یہ ممکن نہیں کہ جنت کا تصور کیا جائے پھر دل یہ نہ کہے کہ اس باغ کو اپنا بناؤ۔ اور اپنا بنانا موقوف ہے اعمال پر۔ پھر اعمال کی برکت سے خدا کے ساتھ تعلق پیدا ہوگا۔ جب خدا سے تعلق پیدا ہوگیا۔ اسیکا نام یاد خدا ہے لیجیے جنت کی یاد کیا ہوئی۔ تمام بھلائیونکی جڑ ہوگئی۔ اور دل سے مانع خیالات نکالنے کا عمدہ علاج ہوگیا۔ اس طرح سے کہ جب دل میں دنیا کی کوئی چیز آوے تو فوراً یہ سوچو کہ ہماری بی بی وہاں منتظر ہے کہ دیکھیے کب ملاقات ہوتی ہے۔ سو مجھکو ایسے کام کرنے چاہئیں۔ جس سے یقیناً ملاقات ہوجائے۔ یہ خیال ایسا ہے کہ دوسرے سب خیالونکو فوراً دبالیگا۔ کیونکہ دنیا میں ایسا کوئی نہیں جسکو بی بی کا شوق نہ ہو۔ اور وہ بی بی بھی کیسی جسکی صفت حدیث میں یہ آئی ہے۔ کہ اگر اوسکے دامن کا ایک کنارہ دنیا میں لٹکا دیں تو اوسکی روشنی کے سامنے چاند سورج ماند ہوجائیں۔ یہ تو اونکے کپڑے کی صفت ہے۔ اور اونکے جسم کی یہ کیفیت آئی ہے کہ متعدد حلوں اور گوشت اور پوست اور ہڈی کے اندر سے گودا نظر آوے گا۔ اسکی نظیر کہیں بھی دنیا میں ہے۔ یا ہوسکتی ہے۔ ایسی بی بی کا خیال ایسی چیز نہیں ہے۔ کہ سرد سے سرد آدمی کو بھی ایکدفعہ گرم نہ کردے۔

اور سستی سے سست کو بھی اعمال کے لئے مستعد نہ بنا دے۔ اسکے سامنے کوئی خیال دل میں نہیں رہ سکتا۔ لیجئے یہ آسان تدبیر ہے خیالات کے دل سے مٹانے کی۔ اور لوگ ذکر اللہ کی تعلیم کرتے ہیں اور میں ذکر الزوجہ کی تعلیم کرتا ہوں۔ مگر یہ کہے دیتا ہوں کہ اسکے بعد آگے بھی چلو۔ زوجہ ہی تک نہ رہ جاؤ اور میرے اسکے کہنے کی کہ آگے کو چلو چنداں ضرورت بھی نہیں۔ کیونکہ یہ زوجہ اپنی طرف کھینچے گی۔ اور اوسکی طرف کھنچنے کا راستہ صرف اعمال ہیں۔ اعمال کے بغیر یہ ہاتھ آ نہیں سکتی تو جس کو اسکا شوق پیدا ہوگا۔ اوسکو اعمال کا شوق پہلے پیدا ہوگا۔ تو میں نے درحقیقت ذکر الزوجہ کی تہیں تعلیم کی۔ بلکہ اسکی آڑ میں تمام اعمال کی اور تعلق مع اللہ کی تعلیم کی ہے۔ اور یہ تعلیم میں اپنی طرف سے نہیں کر رہا ہوں بلکہ حق تعالے یہی تعلیم دے رہے ہیں۔

حور قصور اور نعیم جنت کا ذکر کرکے فرماتے ہیں۔ وفی ذلک فلیتنافس المتنافسون ط یعنی یہ ایسی چیزیں ہیں کہ انہیں حرصا حرصی کریں حرصا حرصی کرنے والے۔ دیکھئے اسمیں امر تحریض فرما دیا ہے حوروں کی حرصا حرصی کا۔ لیجئے ذکر زوجہ کی تعلیم کا قرآن سے ثبوت ہوگیا۔ پھر انکے تصور کے ساتھ حق تعالے کا تصور بھی پیدا ہوگا۔ کہ ان نعمتوں کے دینے والے وہی ہیں۔ پھر حق تعالے کے اس تصور اور اعمال کی برکت سے یہ ہوگا کہ انکا تصور مضمحل اور حق تعالے کا تصور مستحکم ہوتا جائیگا۔ یہاں تک کہ وہی رہ جائے گا یہی مقصود ہے۔ تو ذکر الزوجہ کی تعلیم ذکر اللہ حاصل کرنے کے لئے ہوئی۔ سائنس رو سے فلاسفی اسکی یہ ہے۔ کہ آخرت کے تصور سے اعمال کی ہمت ہوگی۔ اور اعمال سے قرب ہوتا ہے حق تعالے کا۔ اور اوسپر حق تعالے فضل فرماتے ہیں وہ فضل یہ ہوگا کہ وہ خود توفیق دینگے۔ اور آپ کے دل میں اپنی یاد پیدا کردینگے۔ خوب کہا ہے ؎

آب کم جو تشنگی آور بدست + تا بجوشد آبت از بالا و پست

تشنگان گر آب جویند از جہان + آب ہم جوید بعالم تشنگان

پیاسے تو پانی کو ڈھونڈتے ہی ہیں۔ پانی بھی پیاسوں کو ڈھونڈھتا ہے۔ بلکہ واقع یہ ہوا ہے۔ کہ پیاسوں کی تلاش کے لئے پانی پہلے آیا ہے۔ چنانچہ آپ کی

پیاس کے پیدا ہونے سے پہلے پانی پیدا ہوا ہے۔ اُدھر سے فضل پہلے ہوتا ہے تب کچھ اِدھر سے ہوتا ہے ؎

خود بخود آن شہ ابرار بر مے آید ٭ نہ بزور نہ بزاری نہ بزر مے آید

یہ جو کچھ اپنے عمل آپ دیکھتے ہیں۔ پہلے اُدہر سے ارادہ دل میں پیدا کیا جاتا ہے۔ اور توفیق ہوتی ہے۔ پھر آپ کے ہاتھ سے اُن کا ظہور ہو جاتا ہے۔ اس ظہور سے آپ کا نام اُن میں لگ جاتا ہے۔ اور آپ مستحق ثمرات کے ہو جاتے ہیں اسکی حقیقت سوائے اسکے نہیں کہ انکو خود ہی کرم فرمانا اور کچھ دینا مقصود ہوتا ہے۔ یہ غایت کرم ہے۔ کہ آپ کی سعی کی نفی کر کے احسان بھی رکھنا نہیں چاہیئے۔ اور جو کچھ دیتے ہیں آپ کے کسب کا نام لگا کر دیتے ہیں۔ پس عمل کے اسی درجہ کے اعتبار سے یہ حکم کیا گیا ہے۔ کہ آخرت کے تصور سے اعمال کی ہمت ہوگی۔ پھر حق تعالےٰ کا فضل متوجہ ہوگا اور وہ اپنا مقرب بنا لینگے۔ یہ فلاسفی ہوئی ذکر آخرت کے نفع کی اور اسکی ضرورت تھی جسکی میں نے ہندی کی چندی کر دی ؎

جو اس پر بھی نہ وہ سمجھے ٭ تو اس بُت کو خدا سمجھے

مطلب یہ ہے کہ ہر وقت کا فضول دہندا اِدہر اُدہر کا چھوڑو۔ صرف ضرورت کے وقت کام میں اُس کام کی ضرورت سے اوسکے خیال میں لگ جایا کرو۔ پھر جب وہ کام ہو جائے تو اُس دہندے کو الگ کرو۔ آخر مومن کو حق تعالےٰ کے ساتھ عشق کا دعوے ہے۔ اور عشق کی خاصیت سبکو معلوم ہے۔ کہ عاشق کا غیر کی طرف التفات کرنا محبوب کو کسقدر ناگوار ہوتا ہے۔ ایک قصہ اختتام مثنوی میں ہے کہ ایک عورت جا رہی تھی۔ ایک شخص اوسکے پیچھے ہو لیا۔ اوسنے مڑ کر دیکھا۔ پوچھا کہ میرے پیچھے کیوں آتا ہے۔ اسنے کہا میں تیرے اوپر عاشق ہو گیا ہوں۔ اونے کہا بیوقوف میری اوپر کیا عاشق ہوتا ہے۔ پیچھے میری بہن آ رہی ہے۔ وہ مجھ سے کہیں خوبصورت ہے عاشق ہونا ہے تو اوسپر عاشق ہو اوس شخص نے پیچھے کی طرف دیکھا کہ وہ اوس کی بہن کہاں آ رہی ہے۔ آجکل عاشقی ایسی ہی ہے۔ یہ عاشق نہیں ہیں۔ فاسق ہیں۔

؎ وفاداری مدار از بلبلان چشم ✤ کہ ہر دم بر گلے دیگر سرایند

جون ہی اونسے مڑ کر دیکھا کہ عورت نے اسکے سر پر ایک دہول رسید کی اور کہا ؎

گفت اے ابلہ اگر تو عاشقی ✤ در بیان دعوے خود صادقی
پس چرا بر غیر افگندی نظر ✤ این بود دعوئے عشق اے بے ہنر

جب ایک عورت کو غیر کی طرف التفات کرنے سے اتنی غیرت آتی ہے۔ تو خدائے تعالےٰ کو کتنی غیرت آویگی۔ دل تو حق تعالےٰ کا محل ہے۔ اسمیں وہ یہ نہیں پسند کرتا کہ غیروںکو بسا ہوا دیکھے۔ صاحبو! دل میں کسیکو بساؤ نہیں اگر اجنبی کی طرح آجاوے تو مضائقہ نہیں اجنبی کسی مکان میں ہر وقت نہیں آیا کرتا۔ ضرورت کے وقت آتا ہے۔ اور اجازت لیکر آتا ہے۔ اسکا قبضہ مکان پر نہیں ہوتا۔ بس یہی برتاؤ کرو ذکر اللہ اور غیر ذکر اللہ کے ساتھ۔ بتائیے اسمیں کیا وقت ہے۔ میں مکرر کہتا ہوں کہ آخر اس تعلیم میں کونسی دشواری ہے۔ ہاں ایک وجہ بیشک ہے دشوار ہونے کی۔ وہ یہ کہ ہمارا خاصہ ہے۔ کہ ہم پر وہ کام آسان ہوتا ہے۔ جسکی غیرون کو بھی خبر ہو دکہلانا اور سُنانا ہمارے ہر کام میں گویا خمیر رہتا ہے۔ ذکر اللہ بھی اگر آسان ہوتا ہے تو اسی صورت سے کہ لا الٰہ الا اللہ پکار کر کر رہے ہیں۔ زور زور سے ضربیں لگا رہے ہیں سارے محلے کو خبر ہو رہی ہے۔ غرض ذکر بالجہر میں دشواری نہیں ہوتی۔ ذکر خفی میں دشواری ہوتی ہے۔ وجہ کیا ہے کہ جہر کو دوسرے سنتے ہیں۔ اور خفی کو کوئی سنتا نہیں اسیطرح وضع قطع صورت شکل صلحا کی سی بنالی ہے۔ نیچا کرتا ہے۔ پاجامہ اونچا کرلیا ہے یہ سب آسان ہے کسی میں دشواری نہیں۔ دشواری ہے تو اندر کی اصلاح میں ہے کیونکہ اندر کی کسیکو خبر نہیں کہ گوہ بھرا ہے یا کیا۔ کیونکہ اندر کو دوسرا شخص دیکھتا نہیں۔ اندر کچھ ہی رکہیں مثلاً عورتیں جمع رکہیں۔ یا رشوت اور سود بھر ارکہیں تو کسیکو کیا خبر۔ ان سے اگر دل کو پاک کریں تو اسمیں مشقت تو بہت اور محنت کی خبر کسیکو ہوگی نہیں تو نفس کہتا ہے کہ مُفت سے اتنی محنت بھی کی اور کسیکو کانوں کان خبر بھی نہیں۔ تو ناحق گھٹ کر مرے۔ بس یہ عمل اسوجہ سے دشوار ہوجاتا ہے۔ اور اگر یہ بھی کسیطرح

سے دکھا کر کیا جا سکتا تو ہمیں بھی تو رادشواری نہ رہتی یہ ہماری اُسی خاصیت کا اثر ہے
کہ ہم کو وہی کام آسان ہوتا ہے۔ جسکی لوگوں کو خبر ہو۔ اور جسکی لوگونکو خبر نہ ہو وہ دشوار
ہوتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوا کہ ہمارا جو عمل بھی ہے۔ وہ سب مخلوق کے دکھلانیکو
ہے۔ جتنا ظاہر ہم نے بنا رکھا ہے۔ اور جو کچھ ضربیں لگاتے ہیں۔ اور جو کچھ وضع قطع
درست کر رکھی ہے۔ وہ سب لوگوں کے دکھلانے کے لئے ہے اور یہ بہت
خطرناک بات ہے۔ باطن کے عمل تو کرتے نہیں اسواسطے اُنسے محروم رہے اور ظاہر
کے کچھ عمل کرتے ہیں مگر وہ اسواسطے ضائع کہ انہیں للہیت نہیں وہ دوسروں کیلئے
ہیں۔ لہذا اعمال سے مطلقاً خالی رہے اور مزید برآں دکھلاوے کا گناہ سر پر رہا
یہ حالت تو بعض وجوہ سے اس سے بھی زیادہ بُری ہوئی کہ ظاہر کے اعمال بھی نہ
کرتے۔ اس صورت میں یہی ہوتا کہ اعمال سے محروم رہتے۔ گناہ تو سر نہ ہوتا۔
اب تو محرومی بھی ہے۔ اور گناہ بھی سر رہا۔ گو ریار کے ساتھ بھی اعمال کی پابندی
میں یہ مصلحت ضرور ہے کہ اس سے اعمال کی عادت ہو جاتی ہے پھر عادت کے بعد
ریار رخصت ہو جاتی ہے۔ اور اسلئے محققین اعمال ریائیہ کے ترک کی بھی اجازت
نہیں دیتے۔ لیکن تاہم ریار کے مذموم ہونے کا تو انکار نہیں کیا جا سکتا۔ جسکی اس
مقام پر شکایت کیجارہی ہے۔ اور اگر کوئی خدا کا بندہ اعمال ظاہری میں ریار سے
پاک ہے۔ اور اللہ ہی کے واسطے اعمال کر رہا ہے۔ تو اوس سے یہ سوال پھر
بہت سہل ہے۔ کہ اگر اعمال ظاہری کو اللہ کے واسطے کیا ہے تو اعمال باطنی میں
کون چیز اس سے مانع ہے۔ بلکہ اللہ کے واسطے کا مفہوم تو وہاں بطریق احسن صادق
ہے۔ کہ انہیں مخلوق کی نمائش کا احتمال ہی نہیں۔ پھر وہ تم کو کیوں دشوار ہوتے ہیں
جب اعمال باطنی دشوار ہوتے ہیں اور اعمال ظاہری دشوار نہیں ہوتے تو اس سے
تو صاف شبہ ہوتا ہے کہ اللہ کے واسطے کا دعوے غلط ہے۔ بس جو کچھ ہے۔
مخلوق کے دکھلانے کیلئے ہے۔ یہاں نفس ایک اور دھوکہ دیتا ہے اور ریار
میں ایک مصلحت بیان کرتا ہے۔ وہ یہ کہ یوں تو اعمال میں بہت مشقت ہے۔

اوسکے سہل کرنے کے لئے ضرورت ہے۔ بشاشت کی اور کسی کے سامنے ظاہر ہوجانے سے بشاشت ہوجاتی ہے۔ اور عمل صادر ہوجاتا ہے اور اس سے دل نہیں اکتاتا۔ اور اس لئے اوسپر مداومت بھی ہوجاتی ہے۔ اس وہوکہ کا جواب یہ ہے کہ یہ مصلحت اسمیں بیشک ہے۔ مگر اسکی جڑ تو دیکھو کسقدر ناپاک ہے۔ یوں مصلحت سے تو کوئی کام بھی خالی نہیں۔ چوری میں بہت سی مصلحتیں ہیں۔ کتنے آدمیونکی روزی اسکی بدولت چلتی ہے۔ لوہار تالے کیوں بناوے اگر چور نہ ہوں۔ چوکیدار کس بات کی تنخواہ پائے اگر چور نہ ہوں۔ پس اگر مطلق مصلحت پر نظر کیجاوے تو کوئی کام بھی محل منع نہیں ہوسکتا مصلحت سے اول نظر اصل مبنی اور منشا پر کرنا چاہیئے۔ سو یہاں منشار عمل کا اسقدر بُرا ہے۔ کہ اوسکو شرک خفی فرمایا گیا ہے۔ اور وارد ہوا ہے۔ کہ جب یہ ذکر وطاعت جو مخلوق کے دکھلانے کے لئے کیا جاتا ہے قیامت کے دن پیش ہوگا تو کہدیا جاویگا اون ہی سے انعام لو جنکے دکھلانے اور خوش کرنے کے لئے کیا تہا۔ دوسری حدیث میں اور مفصل آیا ہے کہ قیامت کے دن سبسے اول ایک شہید کو بلایا جائیگا۔ اور پوچھا جائیگا کہ تم نے ہماری نعمتوں کا حق ادا کیا۔ عرض کریگا کہ میں نے جان و مال سب آپ کے نام پر فدا کردیا۔ یہاں تک کہ جہاد کیا اور مارا گیا۔ جواب ملے گا۔ کہ تونے جان ہمارے واسطے نہیں دی۔ قتل وقتال جو کچھ کیا تھا وہ صرف اسواسطے کیا تھا کہ لوگ کہیں بڑا بہادر ہے۔ لوگوں کو سُنانے اور شہرت کے لئے یہ کام کیا تہا فقد قیل یعنی شہرت ہوگئی۔ اور جو مقصود تھا یعنی نام وہ دنیا میں حاصل ہوچکا۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو۔ حدیث میں ہے۔ فیؤمر بہٖ فیسحب علی وجھہٖ فیلقی فی النار۔ بس حکم ہوگا۔ کہ لیجاؤ اسکو دوزخ میں ڈالدو۔ یہ شہادت کی جزا ملی۔ ایک مولانا بھی پیشی میں تشریف لائینگے۔ پوچھا جائیگا آپ نے کیا کیا۔ عرض کرینگے میں نے ساری عمر آپکی راہ میں صرف کی۔ پڑھا اور پڑھایا دنیا کے لذات چھوڑ کر یہی کام کیا۔ جواب ملے گا یہ کام ہمارے واسطے نہیں کیا۔ اسواسطے کیا تھا کہ کہا جاوے۔ کہ فلانا بڑا قاری یعنی عالم ہے۔ بڑا مولوی ہے۔ سو یہ غرض حاصل ہوچکی دُنیا میں شہرت ہوگئی۔ اب ہم سے کیا چاہتے ہو۔

فیؤمر بہ الخ - ایک سخی صاحب تشریف لائینگے اونسے پوچھا جائیگا - آپ نے ہمارے واسطے کیا کیا - کہینگے میں نے اپنا تمام مال آپکی راہ میں خرچ کیا - جواب ملے گا جھوٹا ہے - ہمارے واسطے نہیں خرچ کیا - بلکہ اسواسطے خرچ کیا کہ کہا جائے کہ فلانا بڑا سخی ہے - فقد قیل - یہ کہا جاچکا - شہرت ہو چکی - تمہاری غرض حاصل ہو چکی - اَب ہم سے کیا چاہتے ہو - فیؤمر بہ الخ - یہ کیسے کیسے اعمال صالحہ ہیں - مگر جز اکیا ملی جہنم - یہ گت ہے دکھلاوے کی - اسیواسطے کہا گیا ہے ؎

کلید در دوزخ است آن نماز ٭ کہ در چشم مردم گذاری دراز

نماز افضل الاعمال ہے - اور اسپر جو کچھ اجر و ثواب موعود ہیں سب جانتے ہیں - مگر وہ بھی کلید دوزخ بنجاتی ہے - جبکہ اوسمیں قصد غیر اللہ کے خوش کرنے کا ہو - اس سے صاف طور پر ثابت ہو گیا - کہ ہر فعل میں اوسکے منشا - اور مبنی پر نظر کرنا چاہیئے - تو ذکر کے اظہار میں گو یہ مصلحت ہو - کہ اوس سے دل کو اُبھار ہوتا ہے - اور بلا اوسکے ذکر افسردگی کے ساتھ - اور مردہ دل سے ہوتا ہے - لیکن جب اصل منشا - اسکا ریا ہوا اور غیر اللہ کو مقصود بنانا - تو اس عارضی مصلحت پر حکم نہیں ہو سکتا - اصل ہی کا حکم رہیگا - اور بجائے ثواب کے ریا کا گناہ ہو گا - اسیطرح اپنے تمام افعال میں غور کرتے رہا کیجیے - کیونکہ نفس کے بہت سے کید ایسے ہیں کہ وہ ایک عمل کو اچھی صورت میں دکھلاتا ہے - اور حقیقت اوسکی نہایت بُری ہوتی ہے - یہ اوس وہو کہ کا جواب ہو گیا - اور ریا کا مذموم ہونا بحالہ رہا - غرض اپنے اس خاصہ کو تبدیل کیجیے کہ آپ پر وہ کام آسان ہوتا ہے جسکی دوسرے کو خبر ہو - اور جسکی دوسرے کو خبر نہ ہو - وہ دشوار ہوتا ہے - اور چونکہ ظاہر کی خبر دوسرے کو ہوتی ہے - اوسکی درستی آسان ہوتی ہے - اور دل سے غیر اللہ کو خالی کرنا - کسیکو معلوم نہیں ہوتا - اسلیے وہ مشکل ہوتا ہے - جب اس خاصہ میں کچھ تبدیلی کرلوگے اوریہ عبادت چھوٹ جائیگی تو اوسوقت اس تعلیم پر عمل کرتیں کہ کام کے وقت اوسمیں مصروف ہو گئے - اور اوسکو ختم کرکے پھر قلب کو فارغ کرلینا کچھ بھی دشواری نہ رہیگی - بلکہ اوسوقت قدر معلوم ہوگی - کہ اسمیں کسقدر راحت ہے - کہ کام کے وقت کام کیا - پھر دلکو فارغ کرلیا

اور سکون اور چین اور اطمینان اور فراغ کے ساتھ بیٹھے رہے اور اپنے اصلی شغل یعنی ذکراللہ میں لگے رہے۔ اسمیں یہ بھی فائدہ ہوگا کہ بہت سے اشغال سے جو کہ پریشانی کی اصل ہے بچے رہے۔ صرف ایک شغل رہگیا۔ اور ایک شغل میں لگنا تبعاً اطمینان کا باعث ہے دوسری ذکر اللہ خود اطمینان پیدا کرنے والی چیز ہے الا بذکر اللہ تطمئن القلوب۔ اب فرمائیے اطمینان کی زندگی اچھی ہوتی ہے یا پریشانی کی۔ یہاں ایک اور مغالطہ کا بیان کر دینا بھی ضروری ہے جسمیں عوام و خواص سب ہی مبتلا ہوجاتے ہیں۔ وہ یہ کہ جب غیر اللہ کی طرف التفات سے عمل خراب ہوجاتا ہے۔ اور یہ داخل ریا ہے اور بظاہر اوسکی علامت یہ معلوم ہوتی ہے۔ کہ مثلاً ذکر خفی کرنا دشوار ہو۔ اور ذکر بالجہر دشوار نہ ہو۔ تو یہ بات تو سب ذاکرین کو پیش آتی ہے کہ ذکر بالجہر میں لطف زیادہ آتا ہے۔ اور دل نہیں اکتاتا۔ اور ذکر خفی سے جلد دل اکتاجاتا ہے۔ اور اوسمیں ایسا لطف نہیں آتا جیسا ذکر بالجہر میں آتا ہے۔ تو اس سے معلوم ہوتا ہے کہ اسمیں دکھلاوے کا خیال موجود ہے۔ اگر ایسا ہے تو اسکا تو سب پر بڑا اثر ہوگا۔ کیونکہ ذاکرین تو اسکو ریا سمجھکر تنگی میں پڑجاینگے۔ اور گو وہ ذکر کرتے رہینگے۔ مگر دل خوش نہیں ہوگا۔ اور بشاشت نہیں پیدا ہوگی۔ اور ریا جیسے گناہ کا بوجھ سر پر سوار رہیگا۔ جس سے ہمت اونکی ٹوٹ جائیگی۔ یہ اثر تو سالکین پر ہوگا۔ اور عوام پر یہ اثر ہوگا کہ اونکو بہانہ ملجاویگا۔ شرارت کا اور عمل کے چھوڑ دینے کا۔ یوں کہینگے کہ ہمارا عمل ریا سے خالی ہو نہیں سکتا۔ اور ریا کے ساتھ عمل بیکار ہے۔ اور مقبول نہیں۔ تو عمل سے فائدہ کیا۔ پھر کیوں مشقت میں پڑے۔ چلو سہل چھوٹے۔ آرام کرو کہاں کا جھگڑا۔ سو سمجھ لیجئے کہ یہ مغالطہ ہے اور ایسے شبہات غلط فہمی سے پیدا ہوتے ہیں۔ اسکو میں کھولکر بیان کرتا ہوں۔ ذاکرین کے بہت کام کی بات ہے۔ اور علمی قواعد پر منطبق ہے۔ سمجھ لیجئے کہ بشاشت ایک طبعی ہے۔ ایک عقلی۔ تو اظہار عمل سے طبعی بشاشت کا ہونا کہ غیر اختیاری ہے۔ ریا نہیں بلکہ عقلی بشاشت کہ اختیاری ہے۔ ریا ہے۔ اب سمجھو کہ ذکر جہر میں ایک خاصیت ذاتی ہے کہ اسمیں بہ نسبت ذکر خفی کے زیادہ لذت ہے۔ جیسے مثلاً قند میں گڑ سے زیادہ لذت ہے۔

اور اسکا طبعی احساس ہونا کچھ مضر نہیں ہاں اس سے عقلی بشاشت اسلئے کہ دوسروں کو ہمارے عمل کی خبر ہو رہی ہے۔ اور وہ ہم کو بزرگ سمجھیں گے یہ مضر ہے اور دلیل اسکی یہ ہے کہ ریا بیشک گناہ ہے۔ مگر گناہ ہمیشہ فعل اختیاری سے ہوتا ہے ورنہ اگر اسکے قائل ہوں کہ کوئی گناہ ایسا بھی ہے۔ جو اختیاری نہیں یعنی اوس سے بچنا اختیار اور قدرت سے خارج ہے تو تکلیف مالا یطاق لازم آئیگی۔ جسکی نفی آیت میں صراحتہً موجود ہے لا یکلف اللہ نفسا الا وسعھا۔ غرض یہ مسئلہ عقائد کا ہے کہ تکلیف مالا یطاق شریعت میں نہیں ہے نتیجہ یہ ہوا کہ ریا سے بچنا خارج عن الوسع نہیں ہے تو یہ خیال تو غلط ہوا کہ کوئی عمل بدوں ریا کے نہیں ہو سکتا۔ باقی جو خیال ذاکرین کو پیش آتا ہے اور اونکو پریشان کرتا ہے وہ حقیقت میں ریا نہیں بلکہ ریا کا وسوسہ ہے۔ اور گناہ ریا ہے نہ کہ ریا کا وسوسہ یعنی قصداً ریا کرنا گناہ ہے۔ نہ کہ ریا کا بلا قصد آجانا۔ جب قصد حق تعالےٰ کی رضا کا ہے اور خیال ریا کا آ گیا۔ تو کچھ پروا نہیں کرنا چاہیئے۔ اور مطلق پریشان نہ ہونا چاہیئے اس سے کسی قسم کا نقصان عمل میں نہیں آتا۔ بلکہ اس کشاکشی میں اجر بڑھتا ہے۔ کہ شیطان چاہتا ہے کہ اس قسم کے خیالات اور وسوسے دلمیں ڈالکر آدمی کو عمل سے روک دے۔ مگر جب آدمی نہیں رکتا اور اس کشاکشی میں بھی کام کئے جاتا ہے تو اسکو ایک ثواب تو عمل کا ہوتا ہے اور ایک اس مجاہدے کا۔ تو ذاکر کو اور خوش ہونا چاہیئے کہ اتنی ہی دیر عمل کرنے میں ثواب دہرا ہو گیا۔ شیطان کوئی کسر انسان کے نقصان پہنچانے میں نہیں کرتا ہے۔ لیکن اوس سے بھی غلطی ہوتی ہے۔ بسا اوقات وہ ایک کام کرتا ہے۔ نقصان پہنچانے کے لئے اور ہو جاتا ہے اس سے نفع ع۔ عدو شود سبب خیر گر خدا خواہد۔ اسلئے سالک کو کسی حال میں بد دل نہیں ہونا چاہیئے۔ بس خدائے تعالےٰ پر نظر رکھنا چاہیئے اسکو شیطان سے بھی نفع ہی پہنچتا ہے دیکھیئے شیطان کے اس نقصان پہنچانے کے قصد سے یوں نفع پہنچا کہ اجر بڑھ گیا۔ مسلمان کیلئے تو ہر حالت خیر ہی ہے۔ جیسے کسی پرانے ہندو نے کہا تھا کہ مسلمان بھی عجیب آدمی ہیں۔ گھٹ جائیں تو فقیر۔ مطلب یہ ہے کہ جب انکے پاس کچھ نہیں رہتا۔ تو فقیر بنجاتے ہیں۔ اسمیں بھی دو حالتیں ہوتی ہیں اگر خاموشی اختیار کر لی۔ تو چپ شاہ ہو گئے اور جو واہی تباہی بکنا شروع کر دیا تو کہا جاتا ہے کہ یہ رموز ہیں حضرت کے

دوسرا کوئی نہیں سمجھ سکتا۔ غرض گھٹ جائیں تو فقیر اور بڑھ جائیں تو امیر اور مر جائیں تو پیر بنتے لگے قبر پر چڑھاوے چڑھنے۔ غرض ہر حال میں اونچے ہی۔ مسلمان کی یہ واقعی حالت ہے۔ اگر فہیم ہو تو اوسکو کسی چیز سے نقصان نہیں پہنچتا۔ اور مقصود سے اوسے کوئی نہیں ہٹا سکتا۔ یہ فہم کی غلطی ہوتی ہے۔ کہ شیطان سے ڈر کر اوسکے پیچھے ہولیتا ہے اور خسارہ میں پڑ جاتا ہے۔ چنانچہ ذاکر کو بھی جب شیطان ذکر سے روکتا ہے تو محض وسوسہ سے اوسکو پریشان کرتا ہے۔ اور اوسکو اتنی قدرت نہیں کہ کسیکو پکڑ کر عمل سے روک دے پس اگر وہ ذاکر نادان ہے تو اوسکو اس طرح نقصان پہنچ جاتا ہے کہ شیطان نے اس وسوسہ سے اسکو ڈرایا۔ اور وہ دفع وسوسہ کیلئے اُسکے مقابلہ کو کھڑا ہو گیا۔ اور وسوسہ سے ڈر کر اوسکے پیچھے ہولیا۔ پھر جتنی دیر اوسکے پیچھے چلتا رہا۔ اوتنی دیر ذکر سے رہ گیا۔ اسطرح شیطان کا کام بن گیا اور اسکی غرض حاصل ہو گئی۔ کہ ذاکر کو اتنی دیر کے لئے ذکر سے روک دیا۔ تو اے ذاکرین ہوشیار رہو۔ اور خوب سمجھ لو کہ یہ بھی شیطان کا مکر ہے۔ اور گہرا مکر ہے۔ کہ تم کو وسوسہ سے ڈرا کر اپنا کام بنا لیتا ہے۔ اوس سے ہرگز مت ڈرو اور یاد رکھو کہ ذکر نے میں اگر ریا کا وسوسہ آوے تو اسکی کچھ پرواہ مت کرو۔ یہ وسوسہ ریا کا ہے ریا نہیں ہے اسیطرح اسکا محل قعر قلب نہیں۔ حوالی قلب ہے اور قلب میں جو متوہم ہوتا ہے تو وہ اسکا عکس ہے۔ اسکی ایسی مثال ہے۔ جیسے آئینہ کے اوپر کوئی مکھی بیٹھی ہو۔ تو ایک مکھی آئینہ کے اندر بھی نظر آئیگی مگر وہ مکھی آئینہ کے اندر نہیں ہے۔ بلکہ خلاف واقع ایک چیز نظر آتی ہے۔ اوسکو دیکھکر وہ شخص جو آئینہ کی خاصیت کو نہیں جانتا یہ سمجھتا ہے۔ کہ آئینہ کے اندر مکھی ہے۔ چنانچہ بچوں کے سامنے جب آئینہ لاتے ہیں تو وہ اوسکے اندر اپنا عکس دیکھکر سمجھتے ہیں کہ اسکے اندر ہمارا بھائی بیٹھا ہے۔ اور خوش ہوتے ہیں اور اوسکو پکڑنے کیلئے ہاتھ بڑھاتے ہیں وجہ اسکی یہی ہے کہ اونکو آئینہ کی اس خاصیت کی خبر نہیں کہ اوسکے اندر باہر کی چیز کا عکس نظر آیا کرتا ہے جسکا وجود واقع میں کچھ بھی نہیں ہوتا اور سمجھدار آدمی جو اس آئینہ کی خاصیت کو جانتا ہے وہ سمجھتا ہے کہ اسکے اندر کچھ بھی نہیں ہے۔ تو اے سالکین تم بچے مت بنو۔ سمجھ لو کہ اس ریا کا کچھ وجود نہیں۔ شیطان باہر سے عکس ڈالکر تمکو ڈراتا ہے۔ اور چاہتا ہے کہ تم کچھ دیر کو اسکی طرف متوجہ ہو جاؤ

اور اوس سے لڑنے میں اور دفع کرنے میں مشغول ہوجاؤ۔ اور اتنی دیر ذکر سے رہجاؤ
یہ ایسا ہے۔ جیسے ایک بچہ کے سامنے کوئی ڈراونی صورت آئینہ میں دکھائی جائے
کہ وہ اُسکو دفع کرنیمیں اور اوس سے لڑنے میں مصروف ہوجاتا ہے۔ کبھی آئینہ کی طرف
ہاتھ بڑہاتا ہے۔ کبھی آئینہ کے پیچھے ہاتھ لیجاتا ہی۔ مگر ہاتھ اوسکے کچھ بھی نہیں آتا۔ اُس
اضاعت وقت سے بچنے کا طریقہ اگر ہی تو یہی ہی کہ کسیطرح اسکو سمجہا دیا جائے کہ یہ صورت جو
آئینہ میں نظر آرہی ہے اسکا کچھ وجود نہیں اور یہ تجھکو کچھ نقصان نہیں پہنچا سکتی۔ اگر یہ بات اُسکے
ذہن میں آگئی تو اب وہ ہرطرح مطمئن ہوجائیگا۔ اسیطرح یہ ریا کی ڈراونی صورت جو تم کو نظر آتی ہے
سمجھ لو کہ اسکا کوئی وجود نہیں۔ اور اس سے ذرا مت ڈرو۔ یہ تمہارا کچھ نہیں کرسکتی۔ یہ ایک خارجی
چیز کا عکس ہی۔ جو تمہارے دلمیں نظر آیا ہی۔ بس اطمینان سے بیٹھے رہو۔ اور اپنا کام کئے جاؤ
لیکن میں یہ بھی کہے دیتا ہوں کہ اسوقت باوجودیکہ اتنی کچھ شرح کردیگئی اور اسکی حقیقت تبلادی
گئی۔ مگر جسوقت سالک کو یہ مغالطہ پیش آتا ہی اُسوقت اس سے نہ ڈرنا اور مطمئن و مستقل رہنا بہت
مشکل ہوتا ہے۔ نیز بعض اوقات اوسمیں کچھ حصہ ریا کا بھی ہوتا ہے۔ سو اس امتیاز کیلئے بھی اور اگر
وہ وسوسہ ہے تو اوسمیں تسلی کرنیکے لئے بھی دوسرے کی دستگیری کی ضرورت ہوتی ہی۔ اوسوقت
کوئی دستگیر موجود ہو تو بڑا کام نکلتا ہے۔ کیونکہ خود اپنی حالت کو سمجہنا آسان نہیں ہے اور شیخ کو
بصیرت ہوتی ہی۔ کیونکہ وہ بہت سے مغالطے دیکھہ چکا ہے اور بہت سے گرم و سرد دیکھہ چکا
ہے جو پریشانی تم کو پیش آئی ہو وہ اسکو بھی بارہا پیش آچکی ہی۔ اسکو بھی کسی صاحب بصیرت نے
سنبھالا تھا۔ بار بار تجربہ ہونے سے اسکو پوری بصیرت حاصل ہوگئی ہی تو وہ ہر حالت کو پہچانتا
ہے کہ اسمیں کتنا حق اور کتنا باطل شامل ہی۔ اور کتنی واقعیت اور کتنا دہوکہ ہی۔ اور اپنے آپ
اپنی حالت کو اگر کوئی شخص کسیوقت پہچان بھی لے۔ لیکن اپنی تشخیص پر اطمینان نہیں ہوسکتا
پوری پہچان اسیکو ہی جو بارہا تجربہ کرچکا ہے پھر اسکے ساتھ حق تعالےٰ کی مدد بھی شامل
ہوتی ہے۔ اسکا بتایا ہوا علاج سہل اور کامل ہوتا ہے۔ بس مغالطے کے وقت اپنی تجویز
پر اطمینان نہ کرو۔ اپنے مربی اور دستگیر سے مشورہ کرو۔ سہل اور بےخطر طریقہ تو یہی ہی تاہم
اسوقت کا بیان بھی بیکار نہیں۔ کیونکہ کام کی بات کان میں پڑی رہے تو اچھا ہے اسواسطے

اس مغالطے کو حل کر دیا گیا۔ اور طریقہ علاج کا بتلا دیا گیا۔ اور اسکی پہچان بھی بتلا دی۔ کہ دیکھو کہ کس صورت میں ہے اور واقعی گناہ کس صورت میں ہوتا ہے۔ اسکا حاصل بعنوان دیگر یہ ہے کہ غور کر کے دیکھو کہ اصل بنار کار کیا ہے۔ اگر عمل شروع اسیواسطے کیا گیا ہے، کہ مخلوق دیکھے اور ہماری طرف نظریں اٹھیں تو یہ بیشک ریا ہے اس سے ڈرو اور خدائے تعالےٰ کی غیرت کا خیال کرو۔ دنیا میں کوئی بھی اپنے حق میں غیر کو شریک کرنا پسند نہیں کرتا۔ تو خدائے تعالےٰ عبادت میں کسیکو شریک کرنا کیسے پسند کرینگے۔ اور اگر اصل بنار کار مخلوق کو دکھلانا نہیں ہے۔ بلکہ رضار حق مطلوب ہے اور اسپر بے اختیار مخلوق کا خیال طاری ہوگیا۔ تو اوسکو کچھ نہ سمجھو۔ یہ ریا نہیں ہے۔ یہ ریا کا وسوسہ اور خیال ہے۔ اسکی کچھ پرواہ مت کرو۔ اپنا کام کیے جاؤ۔ یہ بحث درمیان میں آگئی تھی۔ لیکن بہت کار آمد ہے۔ اور ریا در کھنے کی باتیں ہیں اصل شکایت یہ تھی۔ کہ صرف وہی عمل کیوں کیے جاتے ہیں۔ جنپر مخلوق کی نظر پڑتی ہے۔ وہ عمل کیوں نہیں کیے جاتے۔ جنپر مخلوق کی نظر نہیں پڑتی۔ بلکہ صرف خالق کی نظر پڑتی ہے۔ یہ بات کیوں ہے۔ کہ ظاہر کو بنایا جاتا ہے۔ صلحا کی سی صورت وضع قطع بنائی جاتی ہے۔ میں یہ نہیں کہتا کہ یہ ظاہر کی درستی بُری بات ہے۔ بلکہ یہ بھی ضروری ہے۔ مگر اسکے ساتھ یہ بات کیوں ہے کہ باطن کو نہیں سنوارا جاتا۔ اس سے تو پتہ چلتا ہے۔ کہ مخلوق کے دکھلانے کا خیال ہے۔ یہی تو ریا ہے ظاہر کو بناتے ہو۔ اور دلکو محفوظ نہیں رکھتے (میں خود بھی انہیں داخل ہوں۔ کوئی یہ نہ سمجھے کہ میں دوسروں ہی پر اعتراض کر رہا ہوں۔ بلکہ ایک واقعی حالت بیان کیجاتی ہے جو سب میں مشترک ہے پس ہم سب کو اصلاح کی ضرورت ہے) آخر اسکی کوئی تو وجہ ہے انہیں غور کرو اور ظاہر کی اصلاح بھی کرو۔ اور باطن کی اصلاح بھی کرو۔ اسطرح سے کہ دلکو اللہ تعالیٰ سے لگاؤ فضول دہندوں میں بے ضرورت نہ لگاؤ۔ کام کے وقت کام میں لگو۔ اور خالی وقت میں اللہ کا دہیان رکھو۔ اگر دل میں اللہ کا دہیان آسانی سے نہیں آتا ہے۔ تو موت کا دہیان لاؤ۔ جنت کا دہیان لاؤ۔ یہ تو آسان ہے۔ موت تو یقینی چیز ہے۔ روزانہ اس کے منظر آنکھوں کے سامنے رہتے ہیں۔ اسکا تصور آنے میں کیا دقت ہے۔ نیز جنت ایسی مزیدار چیز ہے کہ اسکے تصور سے بھی مزا آئیگا۔ اسکا تصور بہت آسانی سے آسکتا ہے۔ خالی وقت

میں اسکو سوچا کرو۔ کہ جنت میں یوں میوے ہیں، یوں پانی ہے۔ یوں مکان ہیں یوں حوریں ہیں۔ اور گو ایک طریق اس مقصود کا دوزخ کا مراقبہ بھی ہے۔ مگر خیر اگر آپ کو اس سے وحشت ہوتی ہے تو دوزخ کا ذکر نہ سہی۔ جنت ہی کو سوچو۔ دوزخی کیوں ہو گو احتمال ہی کے درجہ میں ہو۔ جنتی ہو۔ گو امید ہی کے درجہ میں ہو۔ یہ بھی مقصود کے لئے مفید و کافی ہو جاویگا۔ دوزخ پر ایک قصہ یاد آیا۔ ایک امام تھے۔ رڑکی میں۔ وہ جمعہ کی نماز میں بڑی بڑی سورتیں پڑھا کرتے تھے۔ گرمی کا موسم دھوپ میں لوگوں کو سخت تکلیف ہوتی تھی۔ ایک دن کسی نے نماز کے اقتصار کے لئے کہا۔ تو کہنے لگے۔ ارے تم قیامت کے دن جہنم میں کسطرح رہو گے جب تم سے اتنی سی گرمی کی سہار نہیں ہوتی۔ یہ حضرت لوگوں کو ابھی سے عادت ڈالتے تھے جہنم کی گرمی کے سہار کی۔ گویا انکے نزدیک سب جہنمی تھے۔ جن کا جہنم میں جانا یقینی تھا۔ اسواسطے ابھی سے گرمی کے برداشت کرنیکی عادت ڈالتے تھے مگر وہ خود بھی دھوپ میں کھڑے ہوتے تو ہم جانتے کیسے سہار ہوتی ہے۔ شاید انھیں یہ معلوم نہیں تھا۔ کہ وہاں بھی امام کی ضرورت ہوگی۔ ہر گروہ کا ایک امام ہوگا۔ یقدم قومہ یوم القیامۃ فرعون کے بارہ میں وارد ہے کہ وہ اپنے گروہ کا امام ہوگا۔ اور سب سے آگے جہنم میں جائیگا۔ اگر یہ مقتدی جہنمی ہونگے تو یہ امام صاحب وہاں بھی آگے ہونگے اور سب کی امامت کرینگے۔ اور آگے آگے دوزخ میں جائینگے۔ یہ حکایت بطور لطیفہ کی دوزخ کے لفظ پر یاد آگئی تھی۔ ذکر یہ تھا کہ جنت کو سوچو۔ دوزخ کو نہ سہی۔ دوزخ کو ہم کیوں سوچیں جب ہمارا کام جنت ہی کے نام سے نبجاوے تو دوزخ کا نام کیوں لیں۔ گو افعال تو ہمارے جہنم ہی کے ہیں۔ جنت کی امید لگانا خیال خام معلوم ہوتا ہے مگر کیا کیا جاوے۔ طبیعتیں ضعیف بہت ہیں۔ دوزخ کے ذکر سے احتمال ہے کہ شاید بد دلی پیدا ہو جاوے۔ لہذا جنت ہی کے ذکر کو تبلایا جاتا ہے۔ اور وہ بھی کافی اسطرح ہوگا۔ کہ جب جنت کے مراقبہ سے اوسکا شوق پیدا ہو گیا تو گناہ آپ ہی چھوٹ جائینگے۔ اور یہی مقصود ہوتا دوزخ کے ذکر سے کہ آدمی گناہوں سے توبہ کرے۔ اور اعمال صالحہ کی ہمت کرے جب یہ مقصود جنت کے ذکر سے حاصل ہی تو جہنم کے ذکر پر کیوں زور دیا جاوے۔ بلکہ آجکل کی طبیعتوں کو

دیکھتے ہوئے یہ تجربہ ہے کہ شوق دلانے والے مضامین سے زیادہ نفع ہوتا ہی بہ نسبت خوف دلانیوالے مضامین کے۔ اسی واسطے میں ترہیب کے مضامین زیادہ نہیں بیان کرتا ہوں ترغیب کے مضامین زیادہ بیان کرتا ہوں۔ غرض خلاصہ یہ ہے کہ خدائے تعالیٰ سے تعلق زیادہ کرنیکی کوشش کرو۔ دُنیا کے ذکر فکر میں بھی رہو۔ مگر اسکو عارضی کام سمجھو۔ اپنا اصلی کام ذکر اللہ کو سمجھو۔ اور اگر تعلق مع اللہ براہ راست پیدا نہیں ہوتا۔ تو اسیطرح سہی کہ جنت کی یاد کیجئے۔ اسکا شوق دل میں بھر جائیگا تو فضول چیزوں سے دل خالی ہو جائیگا۔ جب دل فضولیات سے خالی ہو جائیگا تو اسمیں استعداد ہو جائیگی خدا کی یاد بھرنیکی۔ پس شوق جنت بھرنیسے فضولیات سے خلو ہوگا اور اس خلو سے خدا کی یاد بھرگی جس طرح ایک بوتل میں ہوا ہی اسکو پانی سے بھر دیں تو ہوا سے خالی ہوجاوےگی اور پانی سے خالی کر دیں تو ہوا سے بھر جائیگی اسیطرح یہاں ایک ملأ سے دوسرا خلو اور اوس خلو سے دوسرا ملأ حاصل ہوگا۔ کیسی واضح مثال ہی اس سے بہت اچھی طرح سمجھ میں آجاتا ہی کہ جنت کے ذکر سے کیا فائدہ ہی پس ذکر جنت مقصود اصلی نہیں بلکہ اسواسطے اختیار کیا گیا ہی کہ اس سے ذکر اللہ کو حاصل ہونے اور غیر اللہ سے انقطاع ہونے میں سہولت ہو۔ جنت کے ذکر سے حور کے ذکر سے انہار کے ذکر سے دل کو بھرو۔ اسکے بعد وہ دولت جو اصلی مقصود ہی۔ یعنی ذکر خدا۔ بواسطے خلو عن الموانع کے وہ بھی دل میں بھر جائیگی انشاء اللہ تعالیٰ دیکھ لینا۔ لیجئے میں نے جواہرات کو کوڑیوں کے مول کر دیا۔ آپ بھی کوئی ہمت نہ کرے تو اوسکی قسمت۔ الحاصل اصل مرض قلب کا ذکر اللہ سے غفلت ہی جسپر ہم لوگوں کو نظر نہیں اسکی مذمت فرماتے ہیں حضور صلی اللہ علیہ وسلم اس حدیث میں ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہٍ اور عجیب عنوان سے مذمت فرمائی ہے۔ کہ اسکی بُرائی کی حد بیان فرما دی۔ کہ ایسی بڑی چیز ہے غفلت جس سے آدمی کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔ حالانکہ دعاء عند اللہ سب سے احب ہی جسکا مقتضا تھا مقبول ہونا مگر یہ غفلت ایسی چیز ہی کہ اوسمیں بھی مانع ہو جاتی ہے اسکے ہوتے ہوئے دعا قبول نہیں ہو سکتی۔ یہ کسقدر بُرائی ہی چھوٹے سے لفظ میں حضور نے اتنی بڑی بات بیان فرما دی۔ جو بڑے لفظ میں بھی بیان نہیں ہو سکتی تھی یہ ایسا ہی جیسے کوئی سنکھیا کی بُرائی ان لفظوں سے بیان کرے کہ سنکھیا آنتوں کو کاٹ دیتا ہے کہنے کو تو یہ ذرا سے لفظ میں انمیں یہ بھی نہیں کہا گیا کہ سنکھیا قاتل ہی اور اس سے انسان مر جاتا ہی

صرف ایک ذرا سا اثر اسکا بیان کیا گیا ہی کہ آنتوں میں زخم ڈالدیتا ہی مگر یہ اثر ایسا ہی کہ اسکا انجام قتل ہی ہی۔ گو آنتیں بدن میں عضو رئیس نہیں ہیں۔ اور اس اعتبار سے اسکی یہ برائی کہ آنتونکو کاٹ دیتا ہے۔ کچھ زیادہ برائی میں داخل نہ ہونا چاہیے تھا۔ بجائے اسکے یہ لفظ زیادہ موثر ہوتا کہ سنکھیا اعضائے رئیسہ کو خراب کر دیتا ہی لیکن درحقیقت وہی لفظ زیادہ بلیغ ہی کہ آنتونکو کاٹ دیتا ہی اسوجہ سی کہ اعضائے رئیسہ کی بقا آنتونکی بقا پر موقوف ہے۔ تو انکو کاٹنے والی چیز اعضائے رئیسہ کو بطریق اولے خراب کر دیگی۔ اسیطرح غفلت کا یہ نقصان بیان کرنا کہ اس سے دعا قبول نہیں ہوتی۔ معمولی سی بات معلوم ہوتی ہی۔ لیکن غور کرنیسے معلوم ہوتا ہی کہ یہ بہت بڑا نقصان ہے۔ جیسا عنقریب اس عنوان کے تفصیل میں آتا ہے سو اول دیکھنا چاہیئے کہ دعا کیا چیز ہی۔ قرآن مجید میں غور کرنے سے معلوم ہوتا ہی کہ دعا کے دو معنے ہیں اور دونوں یہاں محتمل ہیں۔ ایک معنی ہیں مانگنا۔ اس معنی میں دعا کا لفظ جا بجا آیا ہی اور عام وخاص سب جانتے ہیں کہ دعا کے معنی مانگنا اور سوال کرنا ہیں اور دوسرے معنی ہیں عبادت چنانچہ یدعون من دون اللہ بہت جگہ آیا ہی اسکی تفسیر جمہور مفسرین یعبدون من دون اللہ کے ساتھ کرتے ہیں اور حق تعالےٰ فرماتے ہیں وقال ربکم ادعونی استجب لکم ان الذین یستکبرون عن عبادتی سیدخلون جہنم داخرین۔ ترجمہ حکم دیا ہے تمہارے رب نے کہ مجھکو پکارو۔ میں تمہارے پکارنے کو قبول کرونگا جو لوگ میری عبادت سے تکبر کرتے ہیں وہ جہنم میں ذلیل ہوکر جائینگے۔ اس آیت میں دعا کا امر فرمایا اور اسپر ایک وعدہ فرمایا، پھر عبادت کے ترک پر ایک وعید بیان فرمائی۔ ظاہر ہی کہ اگر دعا عبادت دونوں ایک معنے میں نہ ہوں تو کلام غیر مربوط ہوتا ہی۔ پس یہ قرینہ ہوا اس بات کا کہ دعا اور عبادت سے ایک مراد ہی خواہ ادعونی کے معنے اعبدونی ہوں۔ خواہ عبادتی بمعنی دعائی ہو۔ اور گو اوسمیں دونوں احتمال ہیں کہ دعا بمعنی عبادت ہو۔ یا عبادت بمعنی دعا ہو۔ مجھکو حق حاصل ہے ایک معنی لے لینے کا۔ خصوصاً جبکہ دوسری اکثر جگہوں میں وہی معنی متعین ہیں یدعون من دون اللہ میں یقیناً اور تعییناً دعا عبادت ہی کے معنے میں ہی تو اس احتمال سے تائید ہوتی ہے اس بات کی کہ ادعونی بمعنی اعبدونی راجح ہی۔ اس بنا پر اس حدیث

لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ میں بھی دعا یعنی عبادت ہوگی۔ اور اس مضمون کی مزید تائید
بلکہ قریب قریب فیصلہ اس حدیث سے ہوتا ہے الدعاء مخ العبادۃ۔ اسمیں دعا کی ایک خاص
فضیلت بیان فرمائی گئی ہے کہ دعا مغز ہے عبادۃ کا۔ یہ حدیث صریح ہے اسمیں کہ دعا فرد افضل افراد
عبادۃ ہے تو اگر دعا عبادۃ نہ ہو تو اس حدیث کے کوئی معنے نہ ہونگے تو ہر دعا پر عبادت کا صادق
آنا ضرور ہے۔ تو حدیث زیر بیان میں بھی دعا پر عبادۃ صادق آویگا تو اس صورت میں
لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ کے یہ معنی ہونگے لا یقبل العبادۃ عن قلب لاہ یعنی
حق تعالیٰ عبادت کو خواہ مطلق درجہ میں یا فرد خاص کے درجہ میں قلب غافل سے قبول نہیں فرماتے بہرحال ان الفاظ
میں دلالت ہے اس بات پر کہ عبادت قلب غافل سے قبول نہیں ہوتی اب دیکھیے کہ یہ کتنی بڑی مذمت ہوئی غفلت
کی کہ غفلت کی وجہ سے انسان کی عبادت مطلقہ یا خاصہ قبول نہیں ہوتی حالانکہ انسان پیدا کیا گیا ہے عبادت
ہی کیواسطے اصلی غایت خلق انسان سے عبادت ہی ہے جب وہ ہی قبول نہیں تو انسان محض بیکار ہوا گویا انسان انسان ہی نہ رہا
اس سے زیادہ کیا برائی ہو سکتی ہے دیکھ لیا آپ نے کہ غفلت کسقدر بری چیز ہے اور اس چھوٹے
سے اور معمولی عنوان ان اللہ لا یستجیب الدعاء عن قلب لاہ میں کتنا بڑا مضمون ادا ہوا
ہے۔ جسکا خلاصہ یہ ہے کہ انسان پیدا ہوا ہے عبادت کیلئے اور غفلت مانع ہے اسکی صحت سے۔
تو غفلت وہ چیز ہوئی جس سے انسان انسانیت سے نکل جاتا ہے۔ اب یہاں ایک شبہ ہو سکتا
ہے۔ وہ یہ کہ اسوقت کی تمام تر تقریر مذمت غفلت کا حاصل یہ ہے کہ کسیوقت بھی غفلت نہیں
چاہیئے۔ حالانکہ ابھی یہ بھی کہا گیا ہے۔ کہ غفلت قبول عبادت کیلئے مانع ہے۔ یعنی قبول عبادت
کیلئے عدم غفلت شرط ہے۔ اس جملہ کا حاصل یہ ہے۔ کہ جسوقت عبادت کیجائے اوسوقت غفلت
نہ ہونا چاہیئے۔ اور ظاہر ہے کہ ہر وقت عبادت نہیں کیجاتی تو ہر وقت غفلت کا نہ ہونا بھی
ضروری نہ ہوا تو یہ حکم کہاں صحیح ہوا کہ کسیوقت غفلت نہیں چاہیئے۔ عدم غفلت کا شرط ہونا
قبول عبادت کیلئے ایسا ہوا جیسا وضو کا ہونا شرط ہے صحت نماز کیلئے اور سب جانتے ہیں
کہ وضو کا ہونا نماز کے وقت ضروری ہے دوسرے وقت ضروری نہیں۔ یہ کوئی نہیں کہتا کہ
ہر وقت باوضو رہنا ضروری ہے اسیطرح یوں کہنا لازم ہوگا کہ غفلت کا نہ ہونا عبادت کے
وقت تو ضروری ہے کیونکہ یہ عبادت کے قبول کا موقوف علیہ ہے اور دوسرے وقت ضروری نہیں

جیسے وضو کا ہر وقت رہنا ضروری نہیں۔ جواباً عرض کرتا ہوں کہ حقیقت میں اس عنوان کا مقتضا تو یہی ہے۔ یعنی جب یہ کہا گیا کہ عبادت قبول ہونا موقوف ہے غفلت کے نہ ہونے پر۔ تو اسکے معنی یہی ہونگے کہ عبادت ہی کے وقت اوسکی ضرورت ہے۔ دوسرے وقت ضرورت نہیں لیکن میرا یہ دعوے ہی کہ عبادت کے وقت یاد اور ذکر جب ہی ہو سکتا ہی۔ جبکہ دوسرے وقت بھی غفلت نہ ہو۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ تمام اوقات میں تو غفلت ہو اور عبادت کے وقت غفلت نہ رہے۔ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ آدمی کا دل تمام اوقات میں تو خیالات سے بھرا ہو اور جب نماز پڑھنے کھڑا ہو تو اُن خیالات سے ایک دم دلکو خالی کرلے۔ دل کو خیالات سے خالی کرنا آسان کام نہیں۔ اسکے لیے بڑی مشق کی ضرورت ہے۔ اور کچھ دیر پہلے سے تہیہ کرنا چاہیے۔ اسپر بھی اگر کچھ کامیابی ہو جائے تو بڑی بات ہے تو اسکو وضو پر قیاس کرنا صحیح نہیں۔ بلکہ قیاس مع الفارق ہے۔ وہ فارق یہ ہے کہ وضو کے لیے دیر سے تہیہ کرنیکی ضرورت نہیں جسوقت نماز کا ارادہ ہوا دو منٹ پہلے ارادہ کرکے وضو کرلیا۔ بخلاف ذکر اور یاد قلبی کے کہ اسمیں یہ نہیں ہو سکتا کہ جب عبادت کا وقت آیا اسکو حاصل کرلیا۔ ذکر قلبی صرف اس بات میں تو وضو کے مشابہ ہی کہ موقوف علیہ ہی قبول عبادت کے لئے۔ لیکن اس بات میں مشابہ نہیں کہ جیسے وضو سہل کام ہی کہ عین وقت پر حاصل ہو جاتا ہے ایسے ہی یہ بھی سہل ہو اور عین وقت پر حاصل کرلیا جاوے۔ تو وضو پر اسکو قیاس کرکے یہ حکم اسپر جاری نہیں کر سکتے۔ کہ جیسے وضو صرف عبادت کے وقت ضروری ہے اور دوسرے وقت ضروری نہیں ایسے ہی فراغ قلب اور ذکر صرف عبادت کے وقت ضروری ہو اور دوسرے وقت ضروری نہ ہو۔ یہ ذکر قلبی ایسی چیز ہے۔ کہ جب دیگر اوقات میں بھی اسکی کوشش کیجائے تب ممکن ہی کہ کچھ عبادت کے وقت میں بھی حاصل ہو جاے۔ اس تقریر سے دونوں کا فرق سمجھ میں آگیا ہو گا۔ اور راز اسکا یہ ہی کہ وضو امر حسی ہی او جوارح کا کام ہے۔ جب چاہا کرلیا۔ اسپر پورا اختیار ہے علے ہذا وضو کا ٹوٹنا بھی اختیاری ہی گو اسدرجہ کا اختیاری نہیں جس درجہ کا وضو کا کرلینا ہی۔ مگر ہے تو اختیاری ہی۔ چونکہ وضو وجوداً و عدماً اختیاری ہے۔ اسواسطے کہہ سکتے ہیں کہ تمام وقت میں با وضو رہنا ضروری نہیں۔ کیونکہ وضو کی ضرورت عبادت کے لئے ہی اور اسپر اسدرجہ اختیار حاصل ہی کہ جب چاہیں کر سکتے ہیں۔ تو عبادت کے سوا

دوسرے وقت میں اسکی کیا ضرورت ہے اور ذکر امر قلبی ہے۔ اور یہ تجربہ ہے کہ امر قلبی پر اتنا اختیار نہیں ہوتا جتنا فعل جوارح پر ہوتا ہے اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ امر قلبی اختیار سے خارج ہے کیونکہ اگر اختیار سے خارج کہا جائے تو اسکا امر کرنا تکلیف مالا یطاق کو مستلزم ہوگا۔ قلب پر بھی اختیار ہے اور اسی بنا پر امور قلبیہ کی تکلیف دیگئی ہے۔ لیکن وہ اختیار کالاضطرار ہے۔ اسپر اتنا قابو نہیں ہوتا۔ جتنا فعل جوارح پر ہوتا ہے تو فعل جوارح میں اور فعل قلبی میں فرق ہونا چاہیئے اسواسطے کہا جاتا ہے کہ وضو ہر وقت کرنا ضروری نہیں صرف عبادت کے وقت کر لینا کافی ہے اور ذکر جو مقابل ہے غفلت کا اُسکا ہر وقت کرنا ضروری ہے۔ اس بھروسہ نہیں رہنا چاہیئے کہ عبادت کے وقت کر لینگے۔ اب یہ ایسا ہو گیا جیسے اوس شخص کی حالت ہے۔ جسکا وضو دو گھنٹے سے کم میں نہیں ہوتا۔ بعضے ایسے وہمی ہوتے ہیں کہ وضو میں اُنکو بہت بہت دیر لگتی ہے۔ ایسے آدمی کو کہا جائیگا کہ تمکو نماز سے دو گھنٹے پہلے سے تیار ہونا ضروری ہے۔ اسکا مطلب یہ نہیں ہے کہ یہ کوئی حکم شرعی ہے کہ نماز سے دو گھنٹے پہلے وضو کرنا چاہیئے۔ حکم شرعی تو یہی ہے کہ نماز بلا وضو نہیں ہوسکتی۔ تکبیر تحریمہ سے پہلے وضو ہونا ضروری ہے۔ باقی اس شخص کو جو یہ حکم دیا جاتا ہے کہ دو گھنٹے پہلے سے تیاری کرے۔ اسکی وجہ یہ ہے کہ اسکے لئے وضو وقت پر یعنی تکبیر تحریمہ سے پہلے موجود کر لینا مثل غیر اختیاری کے ہے گو واقع میں اختیاری ہے۔ ایسے ہی اگر اس بات کو مان بھی لیا جائے۔ کہ ذکر اور عدم غفلت صرف عبادت کے وقت ضروری ہے اور غیر اوقات میں ضروری نہیں۔ لیکن ہماری حالت اسی شخص کی سی ہے جو وضو دو گھنٹے سے کم میں نہیں کر سکتا کیونکہ ہم عبادت کے وقت ایک دم دلکو فارغ نہیں کر سکتے اسواسطے ضرورت ہے کہ پہلے سے تیاری کریں اسیواسطے کہا جاتا ہے کہ اس بھروسہ نہ رہو کہ عبادت کے وقت دلکو فارغ کر لینگے اور غفلت کو دور کر دینگے بلکہ عبادت کے سوا دوسرے اوقات میں بھی دلکو فارغ رکھو۔ اور غفلت سے بچاؤ جب ایسا کروگے تب کہیں عبادت کے وقت ذکر اور یاد ہو سکیگی۔ اور غفلت نہ ہوگی۔ یہ نہیں ہوسکتا۔ کہ پہلے سے تیار نہ ہو اور عین وقت عبادت پر تیار ہو جاؤ۔ اور سب خیالات کو دل سے مٹادو ان وہمیوں کے وضو کی مثال سے سمجھ میں آگیا ہوگا کہ عبادت کے سوا دوسرے اوقات میں غفلت ترک کرنے اور ذکر حاصل کرنیکے لئے کیوں کہا جاتا ہے۔ اسمیں اتنا اور اضافہ کرتا ہوں کہ وہمی کی

وضو کی قبلیت کے لئے تو ایک حد ہے مثلاً دو گھنٹے کہ کیسا ہی وہمی ہو اتنے وقت میں وضو کر ہی لیگا۔ لیکن ذکر کی قبلیت کیلئے کوئی حد نہیں۔ کہ مثلاً یوں کہا جائے۔ کہ نماز سے گھنٹہ بھر پہلے یا دو گھنٹے پہلے غفلت کو چھوڑ کر ذکر میں لگو۔ تاکہ نماز میں ذکر اور فراغ قلب حاصل ہو سکے۔ یہ کوئی وقت مقرر نہیں کیا جا سکتا۔ اور بجز اسکے کچھ نہیں کہا جا سکتا کہ ہر وقت قلب کو غیر اللہ اور فضول باتوں سے خالی رکھو۔ جب ہر وقت اسکی کوشش کرتے رہو گے۔ تب نماز کے وقت اس میں کامیابی ہو گی نتیجہ یہی نکلا کہ ہر وقت ضرورت ہوئی ذکر کی اور توجہ الی اللہ کی کوئی وقت ایسا نہیں ہونا چاہیئے جسمیں ذکر نہ ہو اور غفلت ہو۔ آپ کہینگے اچھے اپنے کسی وقت بھی فرصت نہیں۔ ذکر کی ضرورت تو تھی عبادت کے وقت مگر سارا وقت اسی میں آگیا یہ خیال آپ کا صحیح ہے۔ ذکر اللہ کی حقیقت ہے تعلق مع اللہ اور تعلق مع اللہ واقعی ایسی ہی چیز ہے کہ اس سے کسی وقت فراغ نہیں ہو سکتا ؎

بحرے است بحر عشق کہ ہیچش کنارہ نیست ✣ اینجا بجز آنکہ جان بسپارند چارہ نیست

یہ تو جنم روگ ہے۔ اس سے کبھی پیچھا نہیں چھوٹ سکتا اور نہ پیچھا چھوٹنا چاہیئے ہم جو اس سے گھبراتے ہیں اوسکی وجہ یہ نہیں ہے کہ یہ نعوذ باللہ کوئی گھبرانے کی چیز ہے بلکہ وجہ یہ ہے کہ ہم لوگوں کو حس نہیں ہے ہمارا حس الٹا ہو گیا ہے۔ کہ جو چیز گھبرانے کی ہے اس سے تو گھبراتے نہیں اور جو چیز گھبرانے کی نہیں ہے۔ بلکہ تمام چیزوں سے بڑھکر راحت کی چیز اور لذیذ ہے اور ہر چیز کی جان اور روح ہے اوس سے گھبراتے ہیں۔ صاحبو یہ تعلق مع اللہ تو واقعی ایسی ہی چیز ہے کہ ایک لمحہ کے لئے بھی اس سے خالی نہ ہونا چاہیئے ؎

یک چشم زدن غافل ازاں شاہ نباشی ✣ شاید کہ نگاہے کند آگاہ نباشی

جن لوگوں کو یہ حس پیدا ہو گیا اونکے حالات پڑھیئے کہ بات کرنیسے بھی وہ گھبراتے تھے اور ملنے جلنے سے بھی وہ گھبراتے تھے دیکھنے والا اونکو وحشی سمجھتا۔ لیکن وہ ایسے وحشی تھے۔ کہ تمام دنیا کے عاقل اونکے سامنے سر جھکاتے تھے۔ یہ وحشت انکی اسواسطے تھی کہ اونکا حس صحیح ہو گیا تھا۔ گھبرانے کی چیز سے گھبراتے تھے اور انس کی چیز سے انس کرتے تھے انس کی چیز کیا ہے اللہ اور ذکر اللہ اس سے انس رکھتے تھے اور گھبرانے کی چیز کیا ہے

ماسوائے اللہ اور ماسوئے اللہ کا ذکر اس سے انکو وحشت اور نفرت ہوتی تھی۔ سو حضرت
یہ جنم روگ بیشک ہے آپکے پیچھے لگ گیا۔ مگر اس سے گھبرایئے نہیں بلکہ جس کو صحیح کر لیجئے پھر
معلوم ہو جائیگا کہ یہ کسقدر راحت کی چیز ہے پھر اوسوقت اگر کوئی آپ سے اسکو چھڑائیگا۔ تو آپ
جان دینا پسند کریں گے مگر اسکو چھوڑنا پسند نہ کرینگے۔ غرض ذکر اللہ سے گھبرایئے نہیں بلکہ
اس کو حاصل کیجیے ہر وقت نہ ہو تو اتنا تو ہو کہ عبادت کیوقت حاصل ہو لیکن جب عبادت
کے وقت اسکا قصد کروگے تب معلوم ہو گا کہ اسکا عبادت کے وقت حاصل ہونا بھی بلا
اسکے مشکل ہی کہ دوسرے اوقات میں بھی اسکا شغل رکھا جائے اور اسکو وضو پر قیاس نہ کیجئے
ایک اور وجہ سمجھ میں آئی۔ وہ یہ ہے کہ وضو میں وضو کے مزاحم غالب نہیں ہوتے۔ یعنی یہ نہیں
ہوتا کہ جب ہم وضو کرنے بیٹھیں تو کوئی ہم کو ہاتھ پکڑ کر کھینچ لے۔ بلکہ جبتک خود ہم ہی قطع وضو
کا قصد نہ کریں وہ قطع نہیں ہو سکتا۔ بخلاف ذکر کے کہ اسمیں بدون ہمارے قصد کے بھی مزاحم
غالب ہوتے رہتے ہیں جنمیں ہمارے قصد کو کچھ دخل نہیں ہوتا۔ ہم تو چاہتے ہیں کہ ذکر قطع نہ ہو
مگر قطع ہو جاتا ہے۔ پھر شروع کرتے ہیں۔ پھر قطع ہو جاتا ہے۔ وضو میں ایسا کہاں ہوتا ہے کہ وضو
کرنا شروع کریں اور بیچ میں رہجائے۔ پھر شروع کریں پھر بیچ میں رہجائے۔ غرض موقوف علیہ ہونے
میں تو وضو اور ذکر باہم مشابہ ہیں۔ کہ بلا وضو نماز نہیں ہوسکتی اور بلا ذکر عبادت قبول نہیں
ہوتی لیکن ان دو وجہ سے باہم متخالف ہیں کہ وضو اختیاری کامل ہے اور ذکر گویا غیر اختیاری
اور وضو کرنے میں مزاحم نہیں پیش آتے۔ اور ذکر میں مزاحم پیش آتے ہیں اسواسطے یہ جائز
نہیں رہجاویگی کہ جیسے وضو کا عبادت کے متصل ہو جانا کافی ہے ایسے ہی ذکر کا عبادت کے
متصل موجود ہو جانا کافی ہو۔ بلکہ یہ کہا جائیگا کہ ذکر کی ضرورت ہر وقت ہے تاکہ غفلت کی عادت
چھوٹے اور عبادت کے وقت بھی ذکر حاصل ہو۔ غرض ذاکر بننے کیلئے مشق کی ضرورت ہے ورنہ
بدون مشق کے صرف یہی نہ ہوگا کہ دوسرے وقتوں میں غفلت ہو بلکہ یہ ہوگا کہ عبادت میں
بھی غفلت ہوگی اور ذکر حاصل نہ ہوگا چنانچہ ہم کو گونہ یقینی حالت یہ ہے کہ اول تو ذکر کیطرف
توجہ نہیں۔ اور اگر توجہ ہوتی ہے تو یہ حالت ہوتی ہے کہ ہم تیار ہوئے ذکر کیلئے اور دلکو متوجہ کیا
مگر ذکر دل سے نکل گیا۔ پھر متوجہ کیا پھر نکل گیا۔ ذکر کیا کرتے ہیں ادہر ادہر سے بھاگے بھاگے

پھرتے ہیں۔ فرمایئے جب یہ حالت ہے تو کیسے مان لیا جائے کہ ہم کو عبادت کے وقت ذکر حاصل کر لینے اور غفلت کو دُور کر دینے کی کامل قدرت ہے اور ہم کو ذکر کی مشق کی ضرورت نہیں ہے۔ یہ مانا کہ ذکر جو بلا اختیار دل سے نکل جاتا ہے۔ بلا عادت میں مخل نہیں ورنہ آپ کہینگے کہ غیر اختیاری چیز کی تکلیف دیجاتی ہے جسکو تکلیف مالا یطاق کہا گیا ہے۔ جو شریعت میں وارد نہیں ہی۔ لیکن سوچنے کی بات یہ ہے کہ ذکر کا دل سے نکل جانا اسوقت تو بلا اختیار ہی لیکن یہ شروع تو ہوتا ہی اختیار ہی سے یعنی ہم لوگوں نے عادت ڈال لی ہے۔ دل کو ہر وقت فضول خیالات سے پُر رکھنے کی۔ یہ عادت ایسی طبیعت ثانیہ بن گئی ہی کہ اب اُسکے چھوڑنے پر قریب قریب قدرت نہیں معلوم ہوتی۔ تو یہ ذکر کا نکلجانا اسوقت بلا اختیار معلوم ہوتا ہے۔ لیکن اسکا شروع تو اختیار ہی سے ہوتا ہے۔ پھر غالب آکر غیر اختیاری ہوجاتا ہے۔ پس اوس اختیار سے ابتداء کرنے پر نکیر کیجاتی ہے کہ اس عادت کو بدلئے اور یہ بدلنا اختیار سے ممکن ہی۔ جیسا کہ یہ عادت ڈالنا اختیار سے ہوا ہے۔ اسکا ازالہ بھی اختیار سے ہوسکتا ہے۔ اسواسطے اسکی تکلیف دیجاتی ہے۔ اب سمجھہ میں آگیا ہوگا کہ یہ تکلیف مالا یطاق نہیں ہی یہ جو کچھ ہوا ہی تمہارے قصد سے اور پروانہ کرنے سے ہوا ہے اور ایک بات اور قابل غور ہی۔ کہ وضو میں اول تو مزاحم پیش نہیں آتا۔ اور اگر کوئی مزاحمت کرے۔ مثلاً ہاتھ پکڑ لے اور وضو نہ کرنے دے تو ہم کو اس مزاحم کا موجود ہونا فوراً معلوم ہوجائیگا کیونکہ وہ محسوس چیز ہی ہم اسکو فوراً دفع کر دینگے۔ اور یہاں ذکر میں مزاحم بار بار پیش آتا ہی اور ہم کو فوراً معلوم نہیں ہوتا کیونکہ وہ محسوس چیز نہیں ہی۔ تھوڑی دیر تک جب وہ اپنا اثر کر لیتا ہی تب ہم کو معلوم ہوتا ہی۔ پھر ہم اسکو دفع کرتے ہیں۔ پھر وہ اسیطرح اثر کرتا ہی۔ کہ ہم کو خبر نہیں ہوتی۔ پھر ہم خبر ہونے کے بعد اسکو دفع کرتے ہیں۔ غرض اس مزاحم کا اثر ہم پر ہو ہی جاتا ہی۔ کہ تھوڑی دیر کے لئے غفلت ہوجاتی ہی اور وضو میں یہ بات نہ تھی۔ جیسے ہی مزاحم پیش آیا ہم نے دفع کر دیا۔ اور وضو کر لیا۔ تو وضو اور ذکر میں یہ بھی فرق ہوگیا کہ وضو میں بوجہ اطلاع ہوجانے کے مزاحم غالب نہیں آتے اور ذکر میں بوجہ اطلاع نہ ہونے کے غالب آجاتے ہیں۔ غرض ایک وہ فرق تھا کہ وضو فعل جوارح سے ہے اور

ذکر فعل قلب، فعل جوارح پر زیادہ اختیار ہوتا ہے بہ نسبت فعل قلب کے۔ تو وضو پر تو پورا اختیار ہی اور ذکر پر اتنا اختیار نہیں۔ تو ذکر پر اختیار حاصل کرنے کیلئے زیادہ اہتمام اور پہلے سے تیار ہونیکی ضرورت ہے بہ نسبت وضو کے اور ایک یہ فرق ہوا کہ وضو میں مزاحم غالب نہیں آتے اور ذکر میں غالب آتے ہیں۔ یہ بھی اسیکو مقتضی ہی۔ کہ ذکر کیلئے زیادہ اہتمام اور پہلے سے تیاری کیجائے۔ جب دونوں میں فرق ہی تو دونوں کے حکم میں بھی فرق ہوگا۔ اب جواب ہوگیا اس بات کا کہ جب ذکر عبادت کی قبولیت کا موقوف علیہ ہی۔ تو عبادت ہی کے وقت اوسکا وجود کافی ہے۔ ہر وقت اوسکی کیا ضرورت ہی۔ وہ جواب یہ ہے کہ یہ مانا کہ ذکر شرطِ فی العبادہ ہی۔ لیکن اسکی ضرورت ہر وقت ہی۔ کیونکہ اوسکا عبادۃ میں حاصل ہونا خود موقوف ہی دوام پر۔

دوسری ایک بات اور ہے اور وہ اسیوقت سمجھ میں آئی۔ وہ یہ کہ مانا کہ ذکر کی ضرورت عبادت ہی کے وقت ہی۔ مگر ہم پوچھتے ہیں کہ کیا عبادت کیلئے بھی کوئی وقت ہے۔ تم نے عبادت کے معنی نماز پڑھنے ہی کے کیوں لے لئے۔ عبادت کے معنی ہیں۔ عبد شدن یعنی بندہ ہونا۔ تو کیا اسکے لئے بھی کوئی وقت مقرر ہو سکتا ہی۔ اگر اسکے لئے کوئی وقت ہے تو اسکے یہ معنی ہونگے کہ دوسرے وقت انسان عبد نہیں ہی۔ اسوقت کیا ہوگا۔ عبد تو ہے نہیں۔ اِلٰہ ہوگا۔ کیونکہ عبد کا مقابل تو اِلٰہ ہی ہی۔ جب عبد نہیں تو پھر اِلٰہ ہوگا صاحب اگر آپ عبادت سے کسیوقت نکلنا چاہتے ہیں۔ تو اِلٰہ ہونیکا حوصلہ کیجئے۔ کیا آپ اسکے لئے بھی تیار ہیں۔ جیسے ایک گنوار کا قصہ ہی کہ وہ اپنے لڑکے کو میانجی کے پاس لے گیا اور کہنے لگا میانجی اسے قرآن پڑھا دو۔ اور زیادہ نہ پڑھائیو کہیں لوٹ پوٹ پکمبر (پیغمبر) ہو جاوے۔ ایک اور قصہ ہی کہ ایک کم ذات آدمی کسی جگہ جا کر پٹھان بن گیا۔ اسکے بعد کوئی پٹھان پہنچا اوسنے اپنے کو سید بتایا۔ پھر کوئی سید پہنچا اوسنے اپنے کو خدا کا بیٹا بتایا۔ کسی نے پوچھا یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ کہنے لگا جب ایک کم ذات پٹھان ہوگیا اور پٹھان سید تو سید سوا اسکے کہ خدا بنجاوے اور کیا کرے۔ تو حضرت جب آپ بندہ بننے سے نکلے تو پھر خدا ہی کا درجہ ہی۔ اگر انسان بندہ بننے کیلئے نہیں ہے تو کیا خدا بننے

کیلئے ہے۔ پس عبادت سے کسی وقت مستثنے نہیں ہو سکتا۔ اس خدا بننے پر ایک واقعہ یاد آیا۔ میں نے استاد رحمتہ اللہ علیہ سے موکل تابع کرنیکا عمل پوچھا۔ تو فرمایا کیا کروگے۔ میں نے عرض کیا کہ جی چاہتا ہے کہ موکل تابع ہو جائیں۔ جس کام کو جی چاہا انکے ذریعے فوراً ہو گیا۔ فرمایا عمل تو اس قسم کے ہیں مگر میں پوچھتا ہوں کہ انسان بندہ بننے کیلئے ہے یا خدا بننے کیلئے۔ میاں خود تابع بنجاؤ خدا کے۔ بس یہی دولت ہے۔ حکومت کرکے کیا کروگے۔ واقعی عبودیت عجیب چیز ہے۔ دوسرونکو تابع بنانا بھی فضول ہی۔ اور اگر کسی درجہ میں اسکی ضرورت بھی ہے۔ تو اوسکی تدبیر بھی یہی ہے کہ آدمی خدا کا بندہ بنجائے۔ غالباً حضرت شیخ عبدالقدوس گنگوہی قدس سرہ کے وقت میں محدث محمد غوث بڑے عامل تھے۔ گوالیار میں انھوں نے ایک بار شیخ کی اشتیاق زیارت میں موکلو نکو حکم دیا کہ حضرت شیخ کو یہاں اٹھا لاؤ موکل شیخ کے یہاں پہونچے تو دیکھا کہ حضرت نماز میں ہیں انکی ہمت نہ پڑی کہ کچھ تصرف کرسکیں باادب ایک طرف کھڑے ہو گئے سچ ہے ؎

ہر کہ ترسید از حق و تقوے گزید ✤ ترسد از وے جن و انس و ہر کہ دید

جب حضرت فارغ ہوئے تو ان پر نظر پڑی پوچھا کیا ہے۔ عرض کیا ہم اسواسطے بھیجے گئے ہیں فرمایا ہاں اچھا ہم حکم دیتے ہیں کہ اون ہی کو پکڑ لاؤ۔ چنانچہ وہ لوٹ کر گئے اور اونکو پکڑنے لگے۔ اونھوں نے پوچھا کہ یہ کیا کرتے ہو۔ تم تو میرے تابع ہو وہ بولے بیشک مگر اور ونکے مقابلہ میں نہ کہ شیخ کے مقابلہ میں۔ چنانچہ لا حاضر کیا۔ خدا کا نام وہ چیز ہے کہ ہر چیز کو مسخر کرلیتا ہے۔ موکل تابع تھے کسکے اور کام دے رہے ہیں کسکو۔ حضرت شیخ نے عامل صاحب سے پوچھا یہ کیا حرکت تھی۔ عرض کیا حضرت کی زیارت کو دل چاہتا تھا۔ فرمایا زیارت کا یہی طریقہ ہوتا ہے۔ کہ نوکروں سے پکڑ کر بلواؤ۔ پھر فرمایا کہ تم کس خرافات میں مبتلا ہو۔ بندگان خدا کو مجبور کرکے اپنا محکوم کیوں بنا رکھا ہے۔ انکی آنکھیں کھلیں اور حضرت سے بیعت ہوئے۔ اور عملیات سے توبہ کی۔ یہ حکایتیں خدا بننے کے لفظ پر یاد آگئی تھیں۔ ذکر یہ تھا کہ انسان بندہ ہے۔ کسی وقت خدا نہیں بن سکتا۔ ہر وقت بندہ ہی ہے۔ پیدا اسیواسطے ہوا ہے کہ بندہ بنے۔ اور بندہ بننے ہی کا ترجمہ ہے عبادت۔ تو اسکے کیا معنی ہونگے کہ عبادت کیلئے بھی کوئی خاص

وقت ہے۔ اسکے تو وہی معنی ہو جائینگے۔ کہ ایک وقت بندہ بننے کا ہے۔ اور ایک وقت خدا بننے کا۔ غرض انسان ہر وقت بندہ ہے اور ہر وقت اوسکو عبادت کی ضرورت ہی۔ اور حدیث کا مضمون آپ نے سُن لیا کہ عبادت غافل قلب سے مقبول نہیں ہوتی۔ تو ثابت ہو گیا کہ ہر وقت ہی ذکر کی ضرورت ہے۔ اسطرح ثابت ہو گیا کہ غفلت کسیوقت جائز نہیں۔ پہلی تقریر کا حاصل تو یہ تہا کہ ذکر کی ضرورت عبادت ہی کے وقت ہی۔ لیکن ذکر خود عبادت کے وقت بھی بدون اسکے نہیں ہوتا کہ دوسرے اوقات میں بھی اسکا اہتمام و استحضار رہے اسواسطے ضرورت ہوئی اوسپر مداومت کرنے کی۔ اور اس تقریر کا حاصل یہ ہے کہ مانا ذکر صرف عبادت ہی کے وقت ضروری ہی۔ مگر عبادت خود دائمی چیز ہے تو ذکر بھی دائمی مطلوب ہوا دونوں تقریروں میں امر مشترک یہ ہے کہ غفلت کسیوقت جائز نہیں۔ اور خیال تو کیجئے کہ آیا خدا کے ذمہ زیادہ ضروری ہے کہ ہم کو یاد رکہیں یا ہمارے ذمہ زیادہ ضروری ہے کہ ہم خدا کو یاد رکہیں۔ وہ خدا اور غیر محتاج۔ اور ہم بندے اور ہر وقت محتاج۔ ظاہر ہے کہ اونکو یاد رکہنا ہمارے ذمہ زیادہ ضروری ہے۔ وہ اگر ہم کو کبھی بھی یاد نہ کریں تو اونسے کون پوچھنے والا ہی۔ لیکن واقعہ یہ ہی کہ وہ تم کو کسیوقت بھی نہیں بہولتے۔ اگر وہ ایک آن کے لئے بھی بھول جائیں یعنی رحمت کے ساتھ توجہ نہ فرماویں تو عالم درہم برہم ہو جائے۔ پھر کیا اسکا یہی صلہ ہے کہ تم اونکو ہر وقت بھولے ہی رہو۔ کتنی سخت بات ہے^{عہ}۔ ذرا تو انصاف کرنا چاہیئے۔ کیا اسکا کوئی جواب ہو سکتا ہی۔

خلاصہ تمام وعظ کا یہ ہوا کہ ہمارے اندر بڑا مرض غفلت کا ہی۔ اور غفلت بھی کونسی محض فضول ادھیڑ بن کی بدولت اون بے بنیاد باتوں میں دل لگائے رہتے ہیں۔ جنکا سر نہ پیر۔ کہیں گذشتہ باتونکو یاد کر رہے ہیں کہیں آیندہ کی وہ وہ تجویزیں سوچ رہے ہیں جو واقع میں بھی نہیں ہو سکتی اسکا نتیجہ یہ ہی کہ تمام وقت ضائع جارہا ہی۔ حتےٰ کہ عبادت کے وقت بھی اون خیالات سے دل خالی نہیں ہوتا۔ اور ایسی عبادت موافق حدیث مذکور کے قبول نہیں ہوتی۔ اسلئے یہ عبادت کا وقت بھی ضائع گیا۔ اسیطرح ساری عمر ختم ہو جاتی اور بیکا ضائع جاتی ہی اور سب غفلت ہوتی تو خیر غضب تو یہ ہی کہ سب تو غفلت نہیں بس غفلت ہے تو

عہ اسوقت مجمع پر ایک وجد کی سی حالت تھی اور تمام مجمع گونج رہا تھا ۱۲

اللہ سے ہے اور تو سب کی یاد ہے۔ اگر نہیں ہے تو بس اللہ کی نہیں ہے۔ اگر اللہ کی یاد دل میں نہیں رکھ سکتے تو اور ساری دنیا کو بھی بھلا دیا ہوتا۔ تاکہ کہہ سکتے کہ ہم تو کسی کی بھی یاد نہیں رکھتے نہ انکی نہ اونکی۔ جیسے ایک ولایتی کا قصہ ہے۔ کہ ہندوستان میں آیا اور ایک حلوائی کی دوکان پر سے حلوا اُٹھا کر بھاگا۔ لوگ اوسکے پیچھے دوڑے تو جھٹ منہ میں رکھ فرماتے ہیں جاؤ نہ ہمارا رہا نہ تمہارا۔ تو یہ بھی ہوتا تو غنیمت تھا کہ نہ ہمارا خیال ہوتا نہ تمہارا۔ نہ اللہ کی یاد ہوتی نہ کسی اور کی۔ یہاں تو غضب یہ ہے۔ کہ اللہ ہی کو بھلا رکھا ہے قلب سے۔ اور دوسرے سارے جہان کو اُسمیں آباد کر رکھا ہے۔ صاحبو! ان سب کو چھوڑو اور اللہ کی یاد دل میں بساؤ اگر اسکی یاد براہ راست نہیں بستی ہے تو بجائے اسکے کہ فضولیات کی اودھیڑ بُن میں رہو جنت ہی کا تصوّر کیا کرو۔ اور بیوی کا اور حور کا قصور کا۔ اور کبھی اپنے قصور کا بھی۔ اس سے اعانت ہوگی ذکر اللہ کے حصول میں اور غفلت کے دُور ہونے میں۔ بحمد اللہ اسوقت میں نے غفلت دُور کرنے کی ضرورت اور اس کا طریقہ وغیرہ سب بتا دیا ہے۔

اَب میں ختم کرتا ہوں دُعا کیجیے۔ کہ حق تعالےٰ ہمارے قلوب کو غفلت سے نجات دیں۔ اور اپنی یاد اور محبت سے پر کر دیں تاکہ سب امراض دفع ہو جاویں ۔

خلاصہ یہ کہ اس حدیث میں رسُول اللہ صلے اللہ علیہ وآلہ وسلم نے غفلت کی مذمت بیان فرمائی ہے۔ پس اس میں باطن کی اصلاح ہے انتہے بلفظ حضرت مولانا مدظلہ العالی وصلے اللہ تعالےٰ علے خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وعلے آلہ واصحابہ اجمعین واخر دعوٰنا ان الحمد للہ رب العالمین ربّنا تقبل منّا انک انت السمیع العلیم